محشرِ فلسطین

میجر جنرل محمد اکبر خان (ریٹائرڈ)

خورشید عالم

THE ISLAMIC MILITARY SCIENCE ASSOCIATION

الجہاد فی سبیل اللہ

KUDSI

KARACHI-29

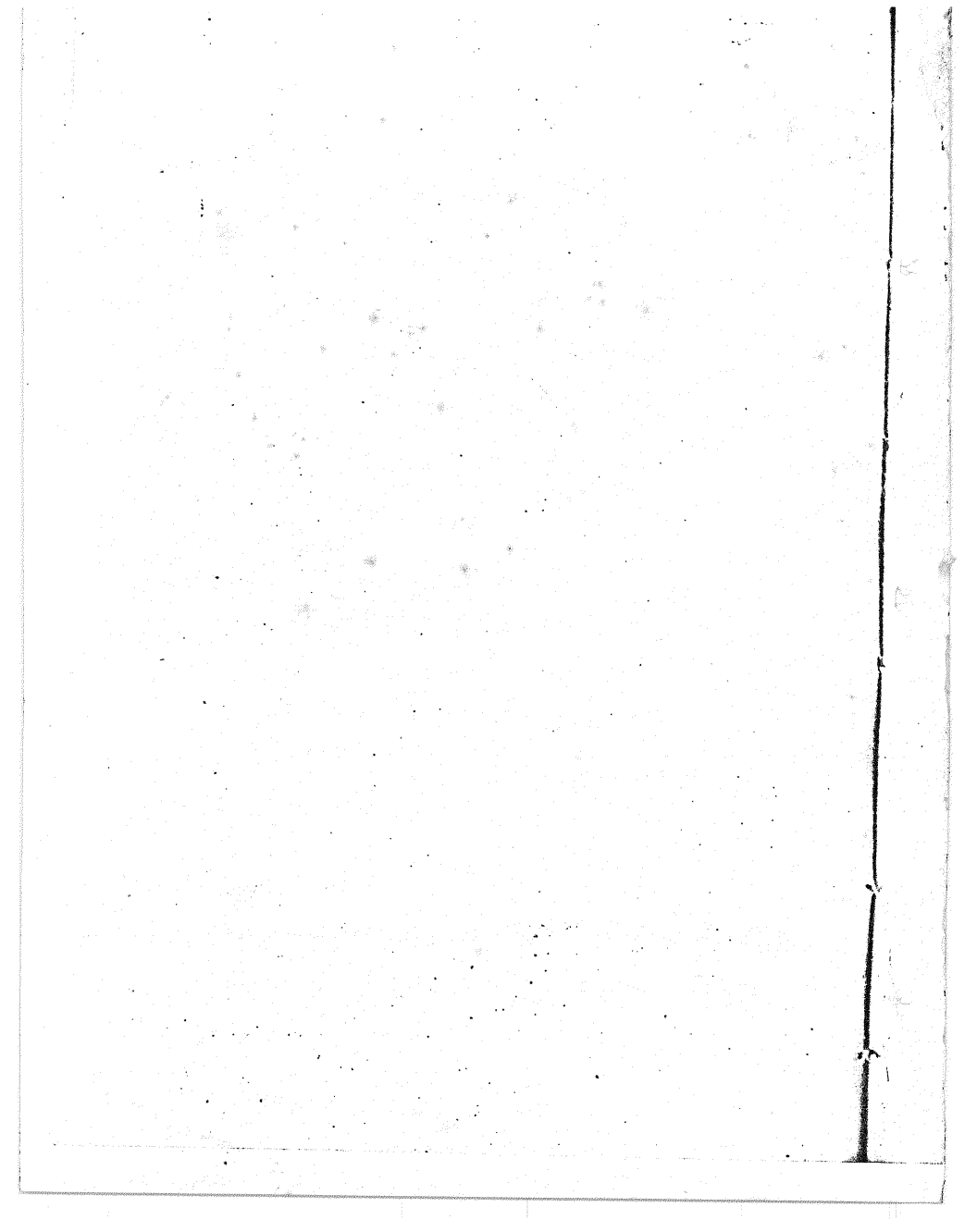

DS
127
.A73

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ

بار اوّل ..... ایک ہزار
۱۹۶۸ء

قیمت ..... ۵ روپے

سرورق اور تصاویر ..... سلیم اختر

طابع :- نوائے وقت پرنٹرز لمیٹڈ - ۴ شارع فاطمہ جناح لاہور
ناشر :- مکتبہ داستاں - ۴ شارع فاطمہ جناح لاہور

۹ میجر جنرل محمد اکبر خان (رنگروٹ)
۲۱ اسرائیلی فتنے کا جنم
۲۸ امریکہ کے عزائم
۳۳ مغربی طاقتیں اسرائیل کو پالنے لگیں
۳۵ اسرائیل ——— اینگلو امریکی بلاک کا اڈہ
۳۹ عالمی سٹریٹیجی
۴۳ عرب کا تیل اور تیل کی جنگ
۴۷ اسرائیلی فتنہ گل کھلانے لگا
۵۴ عرب اسرائیل تصادم ——— جون ۱۹۶۷
۶۵ عرب کیوں ہار گئے؟ تفصیلی تجزیہ
۸۰ صحرائے سینائی کی بکتر بند جنگ
۸۷ اینگلو امریکی نامہ نگار ———
ڈنکرک، برما اور کوریا کو بھول گئے
۹۱ عربوں کی دشواریاں اور کوتاہیاں
۹۵ ٹینکوں کی جنگ ——— صحرائے سینائی اور سیالکوٹ
۱۰۱ رسولؐ کا پیغام یہود کے کام آیا

۱۰۷	اسلامی نظریۂ جہاد چین کے کام آیا	
۱۱۴	فلسطین کس کا ہے ؟ اور کیوں ؟	
۱۱۹	بن گورین ——— یہودیوں کا گورو	
۱۲۷	ایشکول	
۱۲۹	ایبان	
۱۳۱	موشے دایان	
۱۳۸	ریبن	
۱۴۰	گولڈ برگ	
۱۴۲	جمال عبدالناصر	
۱۴۶	مارشل عبدالحکیم عامر مرحوم	
۱۵۲	دنیا کا مرکز ——— تاریخ کی جنگاہ	(حصّہ دوم)
۱۶۱	مسلمانوں کی آمد ——— صلیبی جنگیں	
۱۶۹	عرب اور برطانیہ	
۱۷۹	یہود کا "قومی وطن"	
۱۹۲	فلسطین اقوامِ متحدہ میں	
۲۰۵	نئی صلیبی جنگیں	
۲۱۵	امریکہ کا کردار	
۲۲۹	دوستی اور دشمنی کا بین الاقوامی تصوّر	

میجر جنرل محمد اکبر خان (رنگروٹ)

میں ایک غلط فہمی رفع کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ تاثر عام ہے کہ جنرل محمد اکبر خان "راولپنڈی سازش کیس" میں ملوث ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے مصنف جنرل محمد اکبر خان کسی بھی سازش کیس میں کبھی ملوث نہیں ہوئے تھے نہ "پنڈی سازش کیس" کے ساتھ ان کا کوئی تعلق ہے۔ جنرل صاحب باعزت طریقے سے فوج سے ریٹائر ہوئے تھے۔

میں جب پہلی بار جنرل محمد اکبر خان سے ملنے کے لئے گھر سے چلا تو میرے پیشِ نظر ایک فوجی جرنیل تھا۔ میں نے اُن سے انٹرویو لینے کے لئے وقت طے کیا تھا۔ توقع تھی کہ جنرل کا انٹرویو مورچوں اور معرکوں میں ہی الجھا رہے گا لیکن میں جنرل محمد اکبر خان کی 'سٹڈی' میں داخل ہوا تو وہاں مجھے کتابوں کے انبار اور کتابوں سے اٹی ہوئی الماریاں اور شیلف نظر آئے۔ ان کے درمیان بیٹھا ہوا یہ لمبا تڑنگا، بھرے بھرے جسم والا انسان جرنیل کم اور عالم زیادہ دکھائی دیا اور میں علم اور عمل کے درمیان پھیلے ہوئے روائتی خلا میں بھٹکنے لگا۔ یہ نظریہ عام ہے (جو بہت حد

تک درست ہے، کہ عمل کا بندہ عالم نہیں ہو سکتا اور عالم، جو عمل کرنے والوں کے لئے نت نئی راہیں سوچتا رہتا ہے، عمل کا بندہ نہیں ہو سکتا۔

جنرل محمد اکبر خان نے جب باتیں شروع کیں تو ان کی ذات میں مجھے علم اور عمل کا پُر اثر امتزاج نظر آیا۔ جنرل صاحب بیک وقت علم کے سمندر بھی ہیں اور عمل کے دھنی بھی ——— آپ "اسلامک ملٹری سائنس ایسوسی ایشن" کے روپ میں ایک سرگرم ادارہ ہیں ——— ایسا ادارہ جس کا وجود پاکستانی قوم کی بقاء اور ارتقاء کے لئے از بس ضروری ہے۔

پنشن پر آ کر ہر کوئی آرام کی سوچتا ہے اور زندگی کے ہنگاموں سے دُور ہٹ جاتا ہے۔ فوجی افسر تو اس قدر تھکے ہوتے ہوتے ہیں کہ ریٹائر ہونے کے بعد آرام کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتے۔ وہ عموماً اپنے "مربعوں" پر جا کر تارک الدنیا ہو جاتے ہیں اور باقی زندگی گاؤں اور گھر والوں کو جنگی کہانیاں سناتے اور مزارعوں کے ساتھ جھک جھک کرتے گذار دیتے ہیں۔ لیکن جنرل محمد اکبر خان کو اپنی نہیں قوم کی فکر ہے۔ وہ قوم میں عسکری رُوح اور جنگی صلاحیت بیدار کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں حالانکہ آپ عمر کے اس دور میں ہیں جہاں آپ کو ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق آرام کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ آپ اس مشن کو وعظ سے پورا کرنے کی کوشش نہیں کر رہے بلکہ اپنی ذاتی تجربات اور ان جنگجو قوموں کے جرنیلوں کی خوبیوں اور خامیوں کا تجزیہ پیش کرنے میں مصروف ہیں جنہوں نے تاریخ میں فاتح یا شکست خوردہ کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔

جنرل محمد اکبر خان نے اپنے مشن کی بنیاد اسلامی فنِ حرب اور حدیثِ دفاع

پہ رکھی ہے۔ اس تحقیقی کام میں آپ کا انحصار صرف کتابوں پر نہیں اپنے وسیع ذاتی تجربات کے علاوہ آپ مختلف ممالک کے اُن مقامات کو بھی ملاحظہ کر آئے ہیں جہاں تاریخی معرکے لڑے گئے۔ آپ نے ان علاقوں کو فنِ حرب کی نگاہ سے دیکھا اور ان ممالک کی لائبریریوں سے نایاب لٹریچر حاصل کر کے مواد فراہم کیا ہے۔

اگر جنرل اکبر خان کا صرف ذاتی تجربہ ہی سامنے رکھا جائے تو آپ کے حربی علم کو مکمل اور راستے کو مستند کہنے میں ذرہ بھر تامل محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود جنرل محمد اکبر خان اپنے نام کے ساتھ رنگروٹ لکھتے ہیں جو آپ کا تخلّص بن گیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ علم کی کوئی حد نہیں۔ اس قدر علم اور تجربہ حاصل کر کے بھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں ابھی رنگروٹ ہوں یہ آپ کا عجز و انکسار ہے۔

جنرل محمد اکبر خان چکوال ضلع جہلم کے ایک مایۂ ناز فوجی خاندان کے فرد ہیں۔ آپ میجر خان بہادر راجہ فضل داد خان مرحوم، سردار بہادر او۔ بی۔ ای، او۔ بی۔ آئی کے چھ بیٹوں میں سب سے بڑے بیٹے ہیں۔ آپ کے پانچوں بھائی پاکستان آرمی کے اعلیٰ افسر ہیں یا تھے۔ تین میجر جنرل اور دو بریگیڈیئر کے عہدے تک پہنچے۔ آپ کے آباؤ اجداد نے کابل اور پنجاب کی جنگوں میں حصّہ لیا اور نام پیدا کیا۔ جنرل صاحب کے خاندان اور برادری کے اس قدر افراد فوج میں رہ چکے ہیں کہ اگر قوم کو ضرورت پڑے تو وہ ان سابق فوجیوں کے دو مکمل بریگیڈ میدان میں اتار سکتے ہیں۔

جنرل محمد اکبر خاں پیدائشی سپاہی ہیں۔ برصغیر میں آپ واحد فرد ہیں جو رسالدار (رسالے کے سپاہی) کی حیثیت سے فوج (پروبن ہارس) میں بھرتی ہوئے اور تقسیم ہند سے پہلے ہی آرمی کور کے کمانڈر (جنرل آفیسر کمانڈنگ) کے رتبے تک پہنچے۔

آپ نے جنگی اہلیت، ذہانت اور غیر معمولی صلاحیت کے بل بوتے پر بھرتی ہونے سے آٹھ ہی ماہ بعد وائسرائے کمشنڈ آفیسر کا عہدہ سنبھال لیا۔ آپ کو پہلی بار پہلی جنگِ عظیم میں میسوپوٹیمیا کے معرکے میں اپنی سپاہیانہ قابلیت اور قیادت کے جوہر دکھانے کا موقع ملا اور ۱۹۱۶ میں آپ نے ثابت کر دکھایا کہ آپ توقعات سے بڑھ کر نڈر اور دلیر ہیں۔ اس معرکے میں آپ کا کمانڈنگ آفیسر شدید زخمی ہو گیا تو آپ گولیوں اور گولوں کی بارش میں بھاگتے گئے اور کمانڈنگ آفیسر کو کندھے پر اٹھا کر پیچھے لے آئے۔ آپ ایک بار پھر آگے گئے اور اپنی یونٹ کے ایک اور شدید زخمی افسر کو اُٹھا لائے۔ یہ کارنامہ معجزے سے کم نہ تھا۔

اسی جنگ کے ایک اور معرکے میں ان کے رسالے کی رجمنٹ کے تمام برطانوی افسر اور وائسرائے کمشنڈ افسر (رسالدار اور جمعدار) مارے گئے یا شدید زخمی ہو گئے۔ ادھر ایک گورکھا بریگیڈ (جس میں دو برطانوی پلٹنیں بھی تھیں) دشمن کی فوجوں میں اس بُری طرح گھرا ہوا تھا کہ اُس کے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی جنرل محمد اکبر خان، جو اس وقت جمعدار تھے، اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھے۔ آپ کو فورس کمانڈر جنرل کو رجمنٹ کا محافظ اور رہبر بنا دیا گیا۔ آپ نے اپنے آپ کو اس ڈیوٹی کے لئے رضاکارانہ پیش کیا تھا۔ انہوں نے فورس کمانڈر کی رہبری کر کے خود اپنے رسالے کی کمان سنبھال کر دشمن پر پہلو سے ایسا شدید اور تیز حملہ کیا کہ نرغے میں آیا ہوا بریگیڈ صاف بچ گیا۔ یہ ایک خونریز معرکہ تھا جس میں جنرل محمد اکبر خان کا گھوڑا مارا گیا اور آپ کی ایک ٹانگ زخمی ہو گئی۔

آپ نے بریگیڈ کو تو گھیرے سے نکال لیا لیکن گھوڑا مر جانے اور خود زخمی ہو جانے

اور سپاہی روتے چیختے چلّاتے بھاگے جا رہے تھے۔

اس قیامت میں جنرل اکبر خان کے ساتھ چھ سو مسلمان سپاہی تھے۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی ہتھیار نہ پھینکا اور جنرل اکبر خان کی کمان میں منظم طریقے سے ساحل کی طرف پیچھے ہٹتے رہے۔ ساحل بہت دُور تھا۔ سپاہی بھوکے تھے۔ جنرل اکبر خان نے نہ صرف ان کے لئے انتہائی خطرناک جگہوں سے راشن حاصل کیا بلکہ برطانوی اور فرانسیسی سپاہیوں کو بھی روک روک کر کھانا کھلایا۔ حد یہ کہ انہوں نے ان مسلمان سپاہیوں کی مدد سے زخمی اتحادیوں سپاہیوں کی مرہم پٹی بھی کی اور انہیں ساحل تک بھی پہنچایا۔

ڈنکرک کے ساحل پر برطانیہ کے ہر قسم کے بحری جہاز، پرائیویٹ کشتیاں اور لانچیں آگئیں اور لاکھوں برطانوی اور فرانسیسی سپاہیوں کو انگلستان لے جانے لگیں۔ ہر کوئی سب سے پہلے جہاز یا کشتی میں کود جانا چاہتا تھا۔ اُوپر سے جرمن طیارے فائرنگ کر رہے تھے۔ سپاہی بُری طرح مر رہے تھے۔ بعض سمندر میں کُود کر ڈوب مرے۔

اس قیامت میں جنرل اکبر خان نے جس حد تک ممکن ہو سکا، اتحادی سپاہیوں کو منظم طریقے سے جہازوں وغیرہ میں سوار کرایا اور خود اُس وقت تک ڈنکرک سے نہ نکلے جب تک اتحادیوں کا آخری سپاہی وہاں سے نکل نہیں گیا۔ اس بھگوڑی فوج میں صرف جنرل اکبر خان کے چھ سو مسلمان سپاہی تھے جن کے پاس ہتھیار بھی تھے اور ایمونیشن بھی۔ یہ جنرل اکبر خان کی تنظیم اور حاضر دماغی کا کمال تھا۔

انگلستان میں جنگ کے دوران آپ وہاں کے صفِ اوّل کے اخباروں اور

عسکری جرائد کے لئے فوجی مبصر کی حیثیت سے باقاعدہ کالم لکھتے رہے۔ جنگِ برطانیہ (جنگِ عظیم دوم کے دوران) آپ انگلستان کے ایک کمانڈو ٹریننگ سنٹر میں انسٹرکٹر رہے۔ اسی دوران آپ کی تقریریں بی بی سی (برطانوی براڈ کاسٹنگ کارپوریشن) سے نشر ہوتی رہیں۔ آپ کی جنگی خدمات کو حکومتِ برطانیہ کے وار آفس نے اس حد تک سراہا کہ آپ کو سرکاری طور پر فوج کے مختلف شعبوں کے لئے لیڈر تسلیم کر لیا اور وہاں کے مشہور آرٹسٹ ہنری لیمب نے آپ کی ایک تصویر بنائی جو اب بھی لنڈن کے امپیریل ڈیفنس میوزیم (عجائب گھر) میں موجود ہے۔

۱۹۴۱ میں حکومتِ برطانیہ نے آپ کو امریکہ بھیجا۔ وہاں سے انہیں برصغیر کے دورے پر بھیجا۔ آپ نے برصغیر کے بڑے بڑے شہروں میں جنگ کے متعلق پُر اثر تقریریں کیں اور لوگوں کو قائل کیا کہ یہ جنگ ہر کسی کو لڑنی پڑے گی ورنہ برصغیر ایسی تباہی کی زد میں آجائے گا کہ وہ صدیوں تک آزادی کا خواب بھی نہ دیکھ سکیں گے۔

۱۹۴۲ میں جب جاپان پورے برما پر چھا گیا تھا جنرل اکبر خان کو اس فرنٹ پر بھیج دیا گیا۔ یہاں بھی آپ نے شجاعت اور قیادت کے بے مثال مظاہرے کئے۔

۱۹۴۶ میں آپ کو کرنل کا عہدہ دیا گیا۔ حکومتِ برطانیہ فرانس اور برما میں جنرل اکبر خان کی ذہانت اور صلاحیت سے اس قدر متاثر ہوئی کہ جنگ کے بعد فوجی موٹر ٹرانسپورٹ کی تنظیمِ نو ان کے سپرد کر دی۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ آپ نے یہ کام خوش اسلوبی سے مکمل کر دیا تو آپ کو انڈین آرمی کی تنظیمِ نو کی کمیٹی میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ آپ کو ایسی کئی کمیٹیوں میں شامل کیا گیا۔

۱۹۴۶ میں برصغیر میں ہندوؤں نے فرقہ وارانہ فسادات کی ابتدا کر دی اور

مسلم کشی کو سارے ملک میں پھیلا دیا۔ بعض علاقے غیر معمولی طور پر فساد زدہ تھے آخر حکومت نے اس قسم کے علاقے جنرل اکبر خان کے حوالے کر دیئے۔ آپ نے طاقت سے کم اور تدبر سے زیادہ کام لے کر کئی علاقوں میں امن بحال کر دیا۔ برصغیر کے تمام بڑے بڑے لیڈروں نے (جن میں قائداعظمؒ اور مسٹر گاندھی بھی شامل تھے) جنرل اکبر خان کی کامیابی کی بہت تعریف کی۔ وہیں سے آپ قائداعظمؒ کی نظر میں جچ گئے۔ قائداعظمؒ کو بجا طور پر خوشی تھی کہ انڈین آرمی میں ایک مسلمان اعلیٰ افسر اس صلاحیت کا مالک ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے ہی آپ کو بریگیڈیئر سر پھر میجر جنرل بنایا گیا اور آپ پہلے دیسی افسر ہیں جس نے برطانوی رجمنٹ کی کمان کی۔ یکم اگست ۱۹۴۷ کو آپ کو برطانوی ہند کی فوج کی نمبر ایک کور کا کمانڈر بنایا گیا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو آپ قائداعظمؒ، گورنر جنرل پاکستان کے پہلے ایڈی کانگ مقرر ہوئے۔

قائداعظمؒ کو آپ پر بہت اعتماد تھا۔ انہوں نے جنرل اکبر خان کے سپرد پہلا کام یہ کیا کہ وہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کو سنبھالیں۔ فوراً بعد ہندوستان نے پاکستان کو ابتداء میں ہی ختم کر دینے کے لئے افغانستان کو ساتھ ملا کر مغربی سرحدوں پر حملے شروع کر دیئے۔ پھر کشمیر کو غصب کرنے کے لئے وہاں باقاعدہ جنگ چھیڑ دی تو قائداعظمؒ نے یہ ذمہ داریاں بھی جنرل اکبر خان کو سونپ دیں قائداعظمؒ کی وفات کے بعد جب کشمیر کا بہت سا علاقہ آزاد کرایا جا چکا تھا تو حکومتِ پاکستان نے فائر بندی منظور کر لی۔ جنرل اکبر خان فوج سے ریٹائر ہو گئے۔

آپ نے کم و بیش نصف صدی کی عسکری زندگی میں نہ صرف مختلف محاذوں پر

جنگ کا عملی تجربہ حاصل کیا بلکہ اقوام عالم کی تاریخوں، تاریخ اسلام اور جنگ اور دفاع کے عملی پہلو کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ آپ کا رابطہ دو عظیم جنگوں کے دوران نامور جرنیلوں سے رہا۔ آپ جنگوں کے بعد ان ممالک کے جرنیلوں سے بھی ملے جن کے خلاف آپ لڑے تھے اور ان کے ساتھ فنِ حرب کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔ آپ انڈونیشیا کے ان فوجی لیڈروں سے بھی ملے جنہوں نے گوریلا جنگ سے ولندیزی اور استحادی استبداد سے ملک کو آزاد کرایا تھا۔

آپ چین کے عظیم لیڈر ماؤزے تنگ کے دعوت نامے پر چین بھی گئے تھے۔ آپ ترکوں کے خلاف لڑے بھی اور ترک جرنیلوں کے ساتھ گہری دوستی بھی پیدا کی۔ عرب ممالک کے اعلیٰ فوجی حکام بھی آپ کے مداح ہیں۔

آپ جب ریٹائر ہو کر گھر آئے تو آپ علم اور عمل کا سمندر تھے۔ اس علم اور تجربے نے آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ دنیا کے بدلتے ہوئے احوال و کوائف اور ہندوستان جیسے ناقابلِ اعتبار ہمسائے اور اس کے عزائم کو دیکھتے ہوئے آپ نے شدت سے محسوس کیا کہ ملتِ پاکستانیہ کو دفاعی جنگ کی تربیت کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لئے آپ نے "اسلامک ملٹری سائنس ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور کتابوں کی اشاعت کا وسیع سلسلہ شروع کر دیا۔ اس وقت تک آپ دو درجن سے زیادہ کتابیں، اردو اور انگریزی میں لکھ چکے ہیں۔ ان میں "حدیثِ دفاع"۔ "ہمارا دفاع"۔ "گوریلا وارفیئر"۔ "اسلامی طریقۂ جنگ"۔ "صلاح الدین ایوبی"۔ "رسولِ اکرم صلعم جرنیل کی حیثیت سے"۔ "تیمور اور نپولین"۔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں بعض انگریزی میں لکھی گئی ہیں اور بعض اردو میں۔

آپ کو کتابوں سے جس قدر آمدنی ہوتی ہے اسے "اسلامک ملٹری سائنس ایسوسی ایشن" کے فنڈ میں جمع کرا دیتے ہیں۔ آپ کی کئی کتابوں کے ترجمے چینی اور عربی میں بھی ہو چکے ہیں۔

جون ۱۹۶۷ کے عرب اسرائیل تصادم کے بعد پاکستان کا وہ کونسا اخبار یا رسالہ تھا جس نے اس موضوع پر نہ لکھا ہو۔ بعض پاکستانی نامہ نگار مشرق وسطیٰ کا دورہ بھی کر آئے اور انہوں نے رپورتاژ لکھے۔ میں یہ مضامین پڑھکر سمجھ بیٹھا کہ میں اس موضوع سے پوری طرح واقف ہو گیا ہوں لیکن جب میں عرب اسرائیل تصادم کے متعلق "سیارہ ڈائجسٹ" کے جہاد نمبر (ستمبر ۱۹۶۷) کے لئے جنرل محمد اکبر خان کا انٹرویو لینے گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں نے اس موضوع پر ابھی تک کچھ نہیں پڑھا۔ جنرل صاحب نے عربوں اور اسرائیلیوں کے متعلق ایسے ایسے گوشے بے نقاب کئے جو میں نے کسی اخبار میں نہیں پڑھے تھے۔

میں نے جنرل صاحب کا مختصر سا انٹرویو "سیارہ ڈائجسٹ" میں لکھا تھا جو بہت ہی مقبول ہوا۔ میں نے انہیں اسی روز سے اکسانا شروع کر دیا تھا کہ اس موضوع پر کھل کر لکھیں جسے میں قوم کے سامنے کتابی صورت میں پیش کر سکوں۔ میں جنرل صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے بڑی کاوش سے مجھے یہ مسودہ لکھ دیا۔

جنرل صاحب نے اس موضوع کو تشنہ نہیں رہنے دیا۔ پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ فلسطین کے تاریخی پس منظر کو اور عرب اسرائیل مسئلے کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے کتاب میں ایسا مواد بھی ہونا چاہئے جو غیر جنگی اور سیاسی نوعیت کا ہو۔ چنانچہ "سیارہ ڈائجسٹ" کے مدیر خورشید عالم صاحب نے حامی بھر لی اور بڑی ہی چھان بین

اور تحقیق کے بعد چند ابواب لکھ دیئے۔ انہیں میں کتاب کے آخر میں پیش کر رہا ہوں۔ اس طرح ایک جرنیل اور ایک ایڈیٹر نے مل کر ایک ایسی کتاب تیار کر دی ہے جسے میں اس موضوع کی مستند اور بہت حد تک مکمل دستاویز کہنے میں حق بجانب ہوں۔

عنایت اللہ

ناشر

اسرائیلی فتنے کا جنم

جون ۱۹۶۷ میں عربوں اور یہودیوں کے چند گھنٹوں کے تصادم نے اہلِ پاکستان کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔ ہم میں سے بیشتر نے فیصلہ یہ کہہ کر کہ عرب یہودیوں سے شکست کھا گئے عربوں کو خوب رسوا کیا ہے۔ ہمارے بعض اخباروں نے کم فہم نامہ نگاروں کے لکھے ہوئے مضامین چھاپ کر عربوں کے خلاف مغربی پروپیگنڈے کو خوب نشر کیا ہے اور یوں پاکستان کے عوام کے ذہنوں میں مغرب کے عرب دشمن پروپیگنڈے کے اثرات بہت گہرے کر دیئے ہیں۔ اس غیر ذمہ دارانہ صحافت نے نہ صرف عربوں کے خلاف کئی بے بنیاد باتیں مشہور کر دی ہیں بلکہ اسرائیلی فتنے کو بھی تقویت پہنچائی ہے۔

اس قسم کے فتوے صادر کر دینے سے پہلے سوچنا یہ چاہیئے تھا کہ عرب اسرائیل تصادم کے متعلق ہمیں جو خبریں ملیں کیا وہ مغربی پروپیگنڈہ تو نہ تھیں؟ اور یہ بھی کہ کیا ہم فنِ حرب (سٹریٹیجی STRATEGY) کو سمجھتے ہیں؟

اور یہ بھی کہ کیا ہم اُس پس منظر اور ان احوال و کوائف سے کلی طور پر آگاہ ہیں جن کے تحت 'اسرائیل' معرضِ وجود میں آیا یا لایا گیا تھا ؟ —— افسوس ہے کہ ہم نے جو کچھ کہا اور جو کچھ لکھا وہ پس منظر، پیش منظر اور کوائف کو سمجھے بوجھے بغیر کہا اور لکھا ہے۔

مغربی طاقتوں نے اپنے مذہبی، اقتصادی اور عسکری مقاصد کی خاطر اسرائیلی فتنے کو جنم دیا تھا۔ انہیں اس کی ضرورت پہلی جنگِ عظیم (۱۸ - ۱۹۱۴) کے دوران پیش آئی تھی۔ اس جنگ میں مغربی اتحادی ہر محاذ پر جرمنوں کے ہاتھوں پٹ رہے تھے۔ روس نے بھی جرمنوں سے شکست پہ شکست کھائی تھی۔ فرانس میں بھی جرمن فوجیں دندناتی گھس آئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ترک روس کو ختم کر ڈالیں گے۔ روس کے واویلے پر برطانیہ نے عراق، مصر گیلی پولی اور فلسطین پر حملہ کر دیا تاکہ ترکوں کو اپنے علاقوں میں اپنے دفاع میں لڑنے کے لئے مجبور کر دیا جائے۔

برطانیہ کرنل لارنس اور فلبی جیسے شاطر اور قابل مبصروں کی مدد سے عربوں اور ترکوں کو الگ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے عربوں سے وعدہ کیا کہ ان کی الگ حکومت قائم کر دی جائے گی۔ گو ایشیا اور افریقہ میں برطانیہ اور اس کے اتحادی کامیاب تھے تاہم جرمنی کی طاقت برقرار تھی۔ جرمنی نے اپنی پشت کو مضبوط اور محفوظ کرنے کے لئے روس کے اندر ایسے ماہرین بھیج دیئے جنہیں یہ کام سونپا گیا کہ وہ روسی عوام کو زارِ روس کے خلاف اکسا کر روس میں اسی طرح سے انتشار پیدا کریں جس طرح برطانیہ عربوں میں انتشار

پیدا کر رہا تھا۔ جرمنی اپنی اس سیاسی چال میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس طرح روس میں اشتراکی نظریہ پھیلنے لگا۔

برطانیہ نے اشتراکی وبا سے بچنے کے لئے امریکہ سے مدد مانگی اور امریکہ اپنی شرائط منوا کر جنگ میں کود پڑا۔ یہودیوں کے متعلق امریکہ نے اعلان کیا کہ وہ بالفور اعلان کے مطابق اسرائیلیوں (یہودیوں) کے لئے ایک وطن بنانا چاہتے ہیں۔

اعلان بالفور ۲ر نومبر ۱۹۱۷ کو شائع ہوا تھا۔ اس میں برطانیہ کی حکومت نے یہ یکطرفہ وعدہ کیا تھا کہ وہ فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کے لئے کوشش کرے گی۔ جب عربوں اور دوسرے مسلمانوں نے بالفور اعلان کے خلاف شور مچایا تو برطانیہ نے اس احتجاج کو پروپیگنڈے کے زور سے خاموش کر دیا۔ چنانچہ اسلامی دنیا (خصوصاً عرب دنیا) کی زیادہ تر آبادی اس لوری سے گہری نیند سو گئی لیکن اِکا دُکا صاحبِ نظر جانتے تھے کہ برطانیہ کس قیامت کی چال چل گیا ہے۔

میں بھی اس جنگ میں شریک تھا۔ میدانِ جنگ میں چند کارنامے سرانجام دینے کے صلے میں مجھے برطانوی شاہی کمشن عطا کیا گیا۔ جب یہ خبر برطانیہ میں پھیلی کہ ایک ہندوستانی کو گورا فوج پر کمان کرنے کے حقوق دے دیئے گئے ہیں تو وہاں ہنگامہ بپا ہو گیا۔ اس احتجاج کو قبول کرتے ہوئے برطانوی حکومت نے فوجی کمشن کی ایک نئی قسم اختراع کر لی جسے K.C.I.O. یعنی کنگ کمشنڈ انڈین آفیسر کا نام دیا گیا۔ ہندوستانی لیڈر انگریزوں کی اس چال کو نہ سمجھ

سکے۔ بہرحال جب ڈیوک آف ونڈزر برطانوی ہند کے دورے پر آیا تو مجھے اس کا ایڈی کانگ بنا دیا گیا۔ اس سلسلے میں میرا قیام دلّی میں ہوا۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم و مغفور، جو میرے والد صاحب مرحوم کے گہرے دوست اور میرے کرم فرما تھے، دلی کارونیشن ہوٹل کی اینکسی میں رہتے تھے۔ میں ہر شام ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک شام میں مولانا کے ہاں گیا تو انہوں نے حاضرین محفل سے میرا تعارف کرایا۔ میرے اعزاز کی بنا پر ایک صاحب نے مجھے جنگ کے کارنامے سنانے کو کہا۔ میں حسب فرمائش اپنے جنگی کارنامے سنانے لگا تو سب دلچسپی سے سننے لگے۔

بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ مولانا جوہر نے بڑے پیار سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا ــــ "بیٹا! جن واقعات کو تم فخر سے بیان کر رہے ہو، یہی وہ واقعات اور حادثات ہیں جنہوں نے اسلامی دنیا پر کاری ضرب لگائی ہے۔ میری خلافت کی تحریک کا محرک یہی ضرب اور یہی زخم ہیں جو اسلامی دنیا نے مغرب والوں سے کھائے ہیں۔ میری تحریک کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی دنیا کا ایک محاذ اور ایک مرکزیت قائم ہو جائے۔ جو سر، نواب اور علمار برطانیہ کے ہم نوا ہیں وہ عالم اسلام کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں" ــــ مولانا نے مجھ پر سناٹا سا طاری کر دیا۔ انہوں نے کہا ــ "فیلڈ مارشل ارل ایلنبی بادردی ہونے کے باوجود برہنہ سر، پاپیادہ بیت المقدس میں داخل ہوا اور کہنے لگا" اے خدا! اے مسیح مقدس! تیرے کرم سے آج کروسیڈ ختم ہوا" ــــ یعنی صلیبی جنگ ختم ہو گئی ــــ عیسائیوں نے فتح پائی ہے اور بیت المقدس پھر عیسائیوں کے قبضے

میں آگیا ہے ـــــ مولانا نے یہ بات بتا کر مجھ پر بجلی گرادی۔

جنگِ عظیم ختم ہوئی اور اتحادیوں نے فتح پائی۔ برطانیہ نے امریکی نگرانی میں ترکی خلافت کے علاقے کے کئی ٹکڑے کر دیئے۔ عربوں نے ترکوں کے خلاف باغی ہو کر برطانوی فوجوں کو فاتح بنایا تھا۔ اس کے صلے میں حسین شریف مکہ کے تین بیٹوں کو عراق، شام اور اردن کا بادشاہ بنایا گیا مگر ان بادشاہوں کی حیثیت برصغیر کے راجوں، مہاراجوں اور نوابوں سے زیادہ نہیں تھی۔ ترکی کے عثمانی خلیفہ نے بھی اپنے مفاد کی خاطر برطانیہ کا باج گذار حکمران بننا قبول کر لیا۔ اپنے خواب کی یوں تعبیر کر کے برطانیہ اپنے آپ کو تمام عالمِ اسلام کا شہنشاہ تصور کرنے لگا۔ ترکی کی اسلامی حکومت عملاً ختم ہو چکی تھی۔ مسلمان انگریزوں کی وعدہ خلافی اور چالبازی پر ناراض تو ہوئے مگر وہ مجبور اور معذور کر دیئے گئے تھے۔

عربوں کو یوں بے بس کرنے کے بعد برطانیہ اور امریکہ نے اپنا اصلی اقدام کیا یعنی فلسطین میں یہودیوں کا وطن قائم کرنے کا راستہ ہموار کر دیا اور مغرب کے تمام صیہونیوں ZIONISTS کو اس نئے وطن میں آنے کی دعوت دی۔

مگر حالات کا دھارا کسی اور رخ مڑ رہا تھا۔ ترکی میں ایک نوجوان ترک مصطفےٰ کمال پاشا، اپنی ہمت اور قابلیت کی بنا پر پاشا (جرنیل) بن گیا تھا۔ کمال پاشا نے معجزہ کر دکھایا کہ اتحادی فوجوں کو شکستِ فاش دے کر ترکوں کی آزاد مملکت قائم کر لی۔ ادھر عرب بھی کسی حد تک خوابِ غفلت سے بیدار ہو گئے تھے۔ انہوں نے عربستان اور شام کو برطانوی اثرات اور استبداد سے پاک کر لیا۔ البتہ عرب فوجیں میدانِ جنگ میں تو کامیاب ہو گئیں لیکن سیاسی میدان میں ناکام رہیں۔ بہرحال

سعودی عرب اور شام وغیرہ کی نئی حکومتیں معرضِ وجود میں آگئیں۔ برصغیر کے شمال مغرب میں افغانستان نے بھی برطانیہ کی غلامی سے نجات حاصل کرلی۔ افغانیوں نے آزادی کی یادگار کے طور پر ایک شیر کا مجسمہ بنایا جسے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ اتاترک نے افغانستان اور ایران سے مل کر معاہدۂ سعد آباد پر دستخط کئے۔

جب برطانیہ نے اپنے استعماری عزائم کو یوں پامال ہوتے دیکھا تو اس نے اپنی مخصوص دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے عربوں، افغانیوں اور ترکوں کی آزاد مملکتوں کو تسلیم کر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے ان کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے منصوبوں پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ اس کے پروگرام میں پہلا کام فلسطین سے عربوں کو بے دخل کرنا اور فلسطین پر یہودیوں کو مسلط کرنا تھا۔ یہ کام اس طرح کیا کہ مغربی یہودیوں کو طے شدہ علاقوں میں آباد کر کے خود پارسا بن بیٹھا اور کہہ دیا کہ ہمارا اسرائیلیوں کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں رہا کیونکہ یہ صیہونی دہشت پسند ہیں۔ جب پوچھا گیا کہ ان دہشت پسندوں کے پاس اسلحہ اور دیگر جنگی سامان کہاں سے آیا تو برطانیہ بات کو گول کر گیا۔ اس نے اپنی معذوری کا مزید اظہار اس طرح کیا کہ جنگِ عظیم نے اسے کنگال کر دیا ہے لہٰذا وہ یہودیوں کا کچھ تدارک کرنے سے قاصر ہے۔ یہ عذر پیش کر کے برطانیہ نے اسرائیل سے ظاہر تعلقات منقطع کر لئے اور کہا کہ ہم اسرائیلی علاقے پر زبردستی قابض نہیں رہنا چاہتے۔ برطانیہ نے اس طرح اسرائیل کا قیام ممکن بنا دیا کہ سارے قضیئے کو درپردہ امریکہ کے حوالے کر دیا۔

برطانیہ اور اس کے اتحادی اشتراکی روس کو فتح نہ کر سکے تو دوسری جنگِ عظیم میں انہوں نے جرمنی کو اس کام کے لئے آمادہ کر لیا۔ مگر ہٹلر کو

برسر اقتدار لاتے وقت وہ مردم شناسی میں غلطی کر گئے۔ ہٹلر نے برسر اقتدار آتے ہی اپنی کتاب "میری جدوجہد" میں بر ملا کہہ دیا کہ میں اتحادیوں سے جرمنی کی شکست کا انتقام لوں گا اور اپنی چھینی ہوئی نو آبادیوں کو اُن سے واپس لوں گا۔ جرمنی کے یہودیوں نے ہٹلر کی قوت کو مضبوط کرنے کے لئے نہ کوئی اُسے مالی مدد دی نہ صنعت و تجارت کی نشوونما میں اس کا ہاتھ بٹایا بلکہ جرمنی میں شر پھیلانا شروع کر دیا۔ ہٹلر نے صیہونیوں (یہودیوں) کو جرمنی سے نکل جانے کو کہہ دیا تو انہوں نے اپنی شر انگیزی تیز کر دی جس کی پاداش میں کئی یہودیوں کو سخت ترین سزائیں دی گئیں۔ وہ جرمنی سے بھاگے اور لاکھوں کی تعداد میں فلسطین میں جا آباد ہوئے امریکہ اور برطانیہ یہی چاہتے تھے کہ یہودی فلسطین میں اکٹھے ہو جائیں۔ انہیں فلسطین میں جمع کرنے کا راستہ خود انہوں نے صاف کیا۔

امریکہ اور برطانیہ نے اسرائیل کے موجودہ علاقے کو سفید فام یہودیوں کے لئے مخصوص کر دیا۔ یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ مغربی اخبارات نے اس منصوبے کو اپنے اداریوں میں اس انداز سے دنیا کے سامنے پیش کیا کہ مشرق والوں کو امریکہ اور برطانیہ کی چال کا علم ہی نہ ہو سکا۔ الٹا مشرق کے اخبار مغرب کے اخباروں کی نقالی کرتے رہے اور یوں مشرقی عوام مغربی نقشے سے بے خبر رہے۔

امریکہ کے عزائم

فلسطین میں نہ صرف صیہونیوں کو آباد کیا گیا بلکہ وہاں سے عربوں کو نکالا جانے لگا۔ نکالے جانے والے عربوں میں مسلمان ہی نہیں تھے بلکہ عیسائی عربوں کو بھی اس بناء پر فلسطین سے نکال دیا گیا کہ وہ معاشی، معاشرتی اور علمی لحاظ سے یورپی اور امریکی صیہونیوں سے مختلف ہیں۔ یہ نسلی امتیاز اس حد تک برتا گیا کہ مغربی یہودیوں کو صیہونی ZIONISTS اور مقامی یہودیوں کو Jews یا وتیانوسی یہودی کہا جانے لگا۔ مثلاً مراکش اور تیونس میں جو لاکھوں یہودی آباد تھے (اور اب بھی ہیں) انہیں فلسطین کے نئے وطن میں مدعو نہیں کیا گیا۔ فلسطین سے نکالے ہوئے عربوں کے اعداد و شمار فراہم کئے گئے تو معلوم ہوا کہ ان میں چالیس فیصد مسلمان، تیس فیصد عیسائی اور تیس فیصد 'وتیانوسی یہودی' ہیں۔

عربوں کو اسرائیل سے نکالنے کا ایک جواز یہ بھی پیش کیا گیا کہ غیر قوموں کی موجودگی میں انتظامیہ میں شر اور فساد پیدا ہوتا ہے اور جاسوسی کا خطرہ بھی رہتا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی کہ عربوں (مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں) کا معاشی اور معاشرتی معیار صیہونیوں کے مقابلے میں خاصا پست ہے۔ اس لئے یہاں اشتراکیت کے پھیل جانے کا خطرہ بھی ہے۔

مغربی اخبارات جو شروع سے ہی روس کے آہنی پردے اور چین کی چلمن کے خلاف جھوٹی سچی باتیں لکھتے چلے آئے ہیں، اسرائیل کی غیر انسانی دھاندلیوں پر

اس طرح خاموش رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مغرب کے اخباروں اور ریڈیو کی یہ مجرمانہ خاموشی دراصل اسرائیل کے اندرونی احوال و کوائف کی پردہ پوشی تھی۔ اس مغربی مدد سے اسرائیل ۱۹۱۸ سے ۱۹۴۶، ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۶ تک اور پھر ۱۹۶۷ کی جارحانہ کارروائیوں اور عرب دشمن سرگرمیوں کو صیغۂ راز میں رکھنے میں کامیاب رہا۔ سراغرسانوں اور جاسوسوں کے لئے کسی وقت بھی ممکن نہ ہو سکا کہ اسرائیل کے اندر کی کوئی راز کی بات معلوم کر سکیں۔ اسرائیل نے نسلی امتیاز کی حکمت عملی پر جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ کی نسبت کہیں زیادہ سختی سے عمل کیا۔ افسوسناک اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ اقوام متحدہ میں کسی بھی ملک کے نمائندے نے اسرائیل میں نسلی امتیاز کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہا۔ نہ یورپ کے کسی اخبار نے کبھی بھولے سے بھی اس کا ذکر کیا۔

مغربی طاقتوں کی ترقی اور قوت کا انحصار مشینوں پر ہے اور مشینوں کا انحصار تیل پر اور تیل کا سمندر مشرق وسطیٰ کی ریتیلی زمین کے نیچے بہہ رہا ہے۔ مغربی طاقتوں نے انیسویں صدی میں تیل کے علاقوں میں اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ اپنے علاقوں میں معدنیات کی فراوانی کی وجہ سے ترک، ایرانی اور افغانستانی حکمران ہمیشہ مغربی خطروں سے دوچار رہے۔ مغربی طاقتیں جانتی تھیں کہ مسلمانوں کو قرآن مجید اور اپنے رسول اکرم صلعم کا حکم ہے کہ مسلمان خواہ وہ کرۂ ارض کے کسی خطے کے ہی کیوں نہ ہوں، بھائی بھائی ہیں اور رسول اکرم صلعم کے آخری خطبے کے مطابق ــــــ "نہ عربی کو عجمی پر فوقیت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر۔ صرف اس مسلمان کو دوسرے مسلمانوں پر فوقیت حاصل ہے جو اپنے اعمالِ صالح کی بدولت دوسروں سے افضل ہے"۔

اس طرح خاموش رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مغرب کے اخباروں اور ریڈیو کی یہ مجرمانہ خاموشی دراصل اسرائیل کے اندرونی احوال و کوائف کی پردہ پوشی تھی۔ اس مغربی مدد سے اسرائیل ۱۹۱۸ سے ۱۹۴۶، ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۶ تک اور پھر ۱۹۶۷ کی جارحانہ کارروائیوں اور عرب دشمن سرگرمیوں کو صیغۂ راز میں رکھنے میں کامیاب رہا۔ سراغرسانوں اور جاسوسوں کے لئے کسی وقت بھی ممکن نہ ہو سکا کہ اسرائیل کے اندر کی کوئی راز کی بات معلوم کر سکیں۔ اسرائیل نے نسلی امتیاز کی حکمت عملی پر جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ کی نسبت کہیں زیادہ سختی سے عمل کیا۔ افسوسناک اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ اقوام متحدہ میں کسی بھی ملک کے نمائندے نے اسرائیل میں نسلی امتیاز کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہا۔ نہ یورپ کے کسی اخبار نے کبھی بھولے سے بھی اس کا ذکر کیا۔

مغربی طاقتوں کی ترقی اور قوت کا انحصار مشینوں پر ہے اور مشینوں کا انحصار تیل پر اور تیل کا سمندر مشرق وسطیٰ کی ریتیلی زمین کے نیچے بہہ رہا ہے۔ مغربی طاقتوں نے انیسویں صدی میں تیل کے علاقوں میں اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ اپنے علاقوں میں معدنیات کی فراوانی کی وجہ سے ترک، ایرانی اور افغانستانی حکمران ہمیشہ مغربی خطروں سے دوچار رہے۔ مغربی طاقتیں جانتی تھیں کہ مسلمانوں کو قرآن مجید اور اپنے رسول اکرم صلعم کا حکم ہے کہ مسلمان خواہ وہ کرۂ ارض کے کسی خطے کے ہی کیوں نہ ہوں، بھائی بھائی ہیں اور رسول اکرم صلعم کے آخری خطبے کے مطابق ــــــ "نہ عربی کو عجمی پر فوقیت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر۔ صرف اس مسلمان کو دوسرے مسلمانوں پر فوقیت حاصل ہے جو اپنے اعمال صالح کی بدولت دوسروں سے افضل ہے"۔

اس قرآنی حکم اور رسول اکرم صلعم کے فرمان کے پیشِ نظر مغربی طاقتوں نے مسلمانوں میں ایرانی، افغانی، مصری، ترک، عربی اور حبشی کا امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان میں طرح طرح کی ناچاقیاں تخلیق کی جانے لگیں۔

مغربی طاقتیں ابھی تک نہیں بھولیں کہ ان کی آپس کی چپقلش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہٹلر نے یورپ کو تہ و بالا کر ڈالا تھا۔ یہ طاقتیں دیکھ رہی ہیں کہ روس چین اور ترکی روز بروز طاقتور بنتے جا رہے ہیں اور ایران، پاکستان، مصر (متحدہ عرب جمہوریہ) عراق، اردن، سوڈان، نائجیریا، لیبیا، مراکش، تیونس اور الجزائر ترقی کی راہ پر چل پڑے ہیں۔ مغربی طاقتوں کو تشویش لاحق ہے کہ اگر یہ پسماندہ اقوام ترقی یافتہ ہو گئیں تو مغرب کی صنعت و حرفت اور تجارت تباہ ہو جائے گی اور ان کا عالمی اقتدار بھی ختم ہو جائے گا۔

ان غیر مسلم ترقی یافتہ اقوام نے ستمبر ۱۹۶۵ میں پاکستان کو میدانِ جنگ میں بھی دیکھا ہے۔ پاک افواج نے جس طرح اپنے سے کئی گنا زیادہ بھارتی افواج کو ڈیڑھ ہزار میل لمبے محاذ پر شکست دی ہے، وہ ان اقوام کو پریشان کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ ان پر پاکستان کی عظمت پہلی بار بے نقاب ہوئی۔ اگر ۱۹۴۸ میں کشمیر کے محاذ کی طرح ۱۹۶۵ میں بھی فائر بندی کو پاکستان پر ٹھونسا نہ جاتا تو بھارت نے ہم پر جو جنگ مسلط کی تھی اس کا فیصلہ بہت ہی مختلف ہوتا اور برصغیر میں ایک عظیم تاریخی تغیر آچکا ہوتا۔

ویت نام چھوٹا سا ملک اور ویت نامی بے مایہ قوم ہیں لیکن ویت نامی وطن پرستوں نے امریکہ اور اس کی اتحادی فوجوں کو ابھی تک کسی محاذ پر ٹکنے نہیں

دیا۔ اس جنگ میں صرف امریکہ تین ارب ڈالر ماہانہ خرچ کر رہا ہے۔ ان اخراجات میں وہ امریکی طیارے اور سامانِ حرب شامل نہیں جسے ویت نامی تباہ و برباد کر چکے ہیں۔

چین کا ایٹمی طاقت بن جانا مغربی طاقتوں کے لئے تشویشناک مسئلہ ہے۔ الجزائر کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ الجزائری حریت پسندوں نے نہ صرف فرانس کو بلکہ نیٹو NATO کے تمام اتحادیوں کو شکست دی ہے۔

ترقی پذیر ممالک کی بیداری سے اس صدی میں نوآبادیاتی نظام ختم ہو رہا ہے۔ جو نوآبادیاں باقی رہ گئی ہیں ان پر قبضہ جمائے رکھنے کے لئے مغربی طاقتیں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں اقوام متحدہ کا رویہ غور طلب ہے۔ مثلاً جنوبی افریقہ کے متعلق اس عالمی ادارے میں قراردادیں تو منظور ہوتی رہتی ہیں مگر ان پر عمل درآمد نہیں ہوتا کیونکہ کوئی مغربی طاقت جنوبی افریقہ کی قسمت کو بدلنے پہ آمادہ نہیں۔

یہی حالات ۱۹۱۸ سے ۱۹۴۸ تک فلسطین میں رہے۔ حکومت اسرائیل نے ۱۹۶۷ میں اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل کرنے سے اعلانیہ انکار کر دیا۔ اسے مغربی اقوام کی درپردہ پشت پناہی حاصل ہے۔ عرب اسرائیل تصادم کے بعد وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہم سے پوشیدہ نہیں۔

مغربی طاقتیں خوب جانتی ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی میں عرب کے ریگزاروں سے ایک مردِ خدا اٹھا جسے مسلمان ہی نہیں ساری دنیا محمد الرسول اللہ صلعم کے نام سے یاد کرتی ہے۔ آنحضرت محمد صلعم نے ایران اور روم جیسی بڑی اور طاقت ور

حکومتوں کو ختم کر دیا تھا۔ ان کا خاتمہ تجارتی شاہراہوں پر قبضہ کر لینے سے ہوا تھا۔ ان ملکوں کو نہ خام مال پہنچ سکتا تھا نہ ان کا مال باہر جا سکتا تھا۔ چنانچہ یہ ریاستیں اقتصادی بدحالی کا شکار ہو گئیں۔ اس کے علاوہ رسولِ اکرم صلعم نے ایرانی اور رومی سکوں کو بھی ختم کر دیا تھا۔

اس اسلامی حربے کو یاد کرتے ہوئے مغربی طاقتوں کو یہ تشویش ہو رہی ہے کہ اگر اسلامی ممالک نے ڈالر اور پونڈ کو ترک کر کے اپنا سکہ رائج کر لیا تو مغرب کا تجارتی توازن خطرے میں پڑ جائے گا۔ عرب ممالک کے تیل کی اربوں آمدنی ابھی تک امریکہ اور برطانیہ کے بنکوں میں ڈالروں اور پونڈوں کی شکل میں جمع ہے۔ اگر عرب اپنی یہ رقم ان بنکوں سے نکال لیں تو بنک دیوالیہ ہو جائیں۔

ایسے نازک اور نہایت پریشان کن حالات میں مصر کا بین الاقوامی استعمال کی بحری اور فضائی شاہراہوں کا بند کرنا، عرب ممالک بالخصوص اور اسلامی ممالک کا بالعموم مصر کا ہم نوا ہونا اور یمن اور جنوبی عربستان والوں کا مغربی اثرات کو جھٹکتے چلے جانا مغرب کی تجارت اور اقتصادیات کے لئے موت کا پیغام ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان، ایران اور ترکی کا اتحاد اور یک جہتی مغربی طاقتوں کے لئے کم تشویشناک نہیں۔

ایران تیل کے خزانے کا مالک ہے۔ ادھر پاکستان نے ثابت کر دیا ہے کہ پاکستانی اپنے قومی وقار اور آزادی سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گے خواہ کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ میدانِ جنگ میں ترکوں کا لوہا دنیا بھر نے مانا ہے۔ مغربی طاقتیں اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ پاکستان سینٹو اور سیٹو

میں شمولیت کے باوجود باعزت، باوقار اور آزاد بین الاقوامی پالیسی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ مغربی طاقتیں یہ بھی جانتی ہیں کہ پاکستانی مغرب والوں کی بے انصافی سے نالاں ہیں اور ان کی دوستی کو مغربی طاقتیں غلط سمجھ رہی ہیں۔ پاکستان بین الاقوامی بحری اور فضائی شاہراہوں پر مستحکم بیٹھا ہوا ہے۔

مغربی طاقتیں اسرائیل کو پالنے لگیں

مخصوص حالات و واقعات کی بنا پر حال ہی میں ترکی اور ایران کی حکومتوں نے اشتراکی حکومتوں کی دوستی کی پیش کش کو بخوشی قبول کر لیا ہے۔ نتیجۃً اشتراکی ممالک کے خلاف مغربی طاقتوں کا محاذ خاصا کمزور ہو گیا ہے۔ مغربی طاقتیں چھوٹے ملکوں کو طرح طرح کے معاہدوں میں تو شریک کر لیتی ہیں مگر یہ برداشت نہیں کرتیں کہ چھوٹے ملک ان کے برابر کی حیثیت حاصل کریں۔ ناکامیوں کے باوجود یہ طاقتیں دور اندیشی سے کام نہیں لے رہیں۔ ان کے رویے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دلوں میں ترقی پذیر اقوام کے خلاف کس قدر تعصب اور کھوٹ بھرا ہوا ہے۔

جب امریکہ دنیا کی واحد ایٹمی قوت تھا تو کسی حکومت نے اس کے اس دعوے کو کہ امریکہ امن عالم کا پاسبان ہے، چیلنج نہ کیا۔ امریکہ اس کوشش میں مصروف

رہا کہ اشتراکی ممالک ایٹمی طاقت سے محروم رہیں مگر اس کی کوشش اور خواہش پوری نہ ہو سکی۔ چنانچہ اس نے فرانس اور برطانیہ کو بھی ایٹمی راز دے دیئے۔ پھر نیٹو، سینٹو اور سیٹو جیسے معاہدے محض اس مقصد کے لئے کئے کہ متعلقہ ممالک میں ایٹمی اڈے قائم کئے جائیں۔ مگر حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ امریکہ کے اتحادی ممالک ان معاہدوں میں خوشی سے شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ انہیں اس شرکت پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب فرانس الگ ہو گیا ہے۔

پہلی جنگِ عظیم میں امریکہ نے برطانیہ کو جو مدد دی تھی، ان قرضوں کی ادائیگی نے برطانیہ کی دولت امریکہ پہنچا دی۔ دوسری جنگِ عظیم میں بربادی یورپی ممالک کی ہوئی۔ برطانیہ، فرانس اور بلجیم جیسے ممالک امریکہ سے قرضے لے کر اپنی اقتصادی، صنعتی اور تجارتی حالت کو سدھار سکے۔ مگر خام مال کی منڈی اور تیار مال کے نکاس کے علاقے ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ پھر بھی انہوں نے سر توڑ کوشش کر کے اپنی اقتصادی حالت کو سنبھال لیا اور اب امریکہ سے خفگی کا اظہار کھلم کھلا کر رہے ہیں۔

جب روس بھی ایٹمی قوت بن گیا تو امریکہ کو بہت دکھ ہوا۔ وہ تو دنیا بھر کا ان داتا اور رکھوالا بنا بیٹھا تھا۔ اُدھر قبرص اور مالٹا نے اپنے ملکوں سے امریکی اڈے ہٹانے کا نوٹس دیا تو کچھ اور ملک بھی اس صف میں شامل ہو گئے۔ اپنی بمبرداری کو یوں ختم ہوتے دیکھ کر امریکہ کی نظر اسرائیل پر پڑی۔ چنانچہ برطانیہ سے مل کر اسرائیلی اڈے کو مستحکم کرنے کے لئے ۱۹۴۸ کی جنگ ہوئی جسے ختم کرتے وقت اسرائیلی علاقے میں توسیع کر دی گئی۔ اُدھر مصر میں تغیر آیا۔ شاہ فاروق کو جلا وطن کر کے پہلے نجیب پھر ناصر نے مصر کی حکومت سنبھال لی۔ مصر کے بری اور بحری اڈے اور

بحری اور فضائی شاہراہیں مغربی طاقتوں کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ اس لئے ان طاقتوں کے لئے ناصر کی حکومت کو ختم کرنا لازمی ہو گیا۔

مگر امریکہ اور برطانیہ چین سے جنگ میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ چیانگ کائی شیک کی گرتی ہوئی دیوارِ اقتدار کو تھامے رکھنے میں لگے ہوئے تھے۔ ہند چینی، الجزائر اور تیونس میں فرانس برسرِ پیکار تھا۔ اسرائیل نے شرم شیخ پر قبضہ کر کے ایلیہ بندرگاہ سے الحاق کر لیا اور خلیج عقبہ کو اقوامِ متحدہ کی افواج نے (جو کینیڈا اور بھارت کی تھیں) اپنی بحری آمدورفت کا اڈہ بنا لیا۔ جواز یہ پیش کیا گیا کہ مصر کے صدر ناصر نے اسرائیلی جہازوں کو سویز سے گذرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس سے اسرائیل کو دراصل منہ مانگی مراد مل گئی تھی۔ ناصر کی حکومت نوزائیدہ ہونے کی وجہ سے معذور سمجھی تھی، پھر بھی اس نے خلیج عقبہ کے متعلق غیروں کے فیصلے کو تسلیم نہ کیا۔

اسرائیل ـــــ انگلو امریکی بلاک کا اڈہ

ایلیہ کو اسرائیلی نئی بندرگاہ کہتے ہیں لیکن یہ ان کی ملکیت نہیں تھی۔ صدیوں سے یہ بندرگاہ مسلمانوں کے مصرف میں رہی۔ اسی طرح نہر سویز کو فرانس اور برطانیہ

کی تخلیق سمجھا جاتا ہے لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر بن عاصؓ، فاتح مصر نے اسے کھدوا کر بحیرۂ روم سے ملایا تھا۔ جب حجاز میں خوفناک قحط پڑا تھا تو اس نہر کی بدولت ایلیہ، ینبوع اور جدّہ کی بندرگاہوں کو بیک وقت استعمال کر کے متاثرہ مقامات پر غلّہ پہنچایا گیا تھا اور قحط پر قابو پا لیا گیا تھا۔

دنیا کے سیاسی تغیّر سے دفاعی ضروریات بڑھ گئیں تو مغربی طاقتوں نے نہر سویز اور عرب ممالک پر ایک بار پھر قابض ہو جانے کی کوشش کی اور ۱۹۵۶ میں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے مصر پر حملہ کر دیا۔ اینگلو امریکی بلاک کی نیت کو بھانپتے ہوئے روس خاموش نہ رہ سکا اور اس نے سب کو للکارا۔ امریکہ بظاہر روس کا ہمنوا بن گیا لیکن چال یہ چلی کہ اُسی سال اقوام متحدہ کی فوجیں متعین کر کے اسرائیل کا ہاتھ اور زیادہ مضبوط کر دیا۔ اس طرح امریکہ اپنی سیاسی اور دفاعی چال میں کامیاب ہو گیا۔ امریکہ کی شہ پر اسرائیل نے اپنے دہشت پسندوں کی مدد سے ان علاقوں سے عربوں کو نکالنا شروع کر دیا جن پر اسرائیل نے ۱۹۴۹ میں غاصبانہ قبضہ جما لیا تھا۔ عرب اپنے وطن میں بھی مجبور تھے اور اقوام متحدہ جیسے عظیم عالمی ادارے میں بھی مجبور ہی رہے۔ اُن کے احتجاج پر اقوام متحدہ میں کوئی قرار داد پاس ہو جاتی تو اس پر عمل نہ ہوتا کیونکہ امریکی طاقت اور دولت کے زیر اثر بیشتر ممالک ووٹ دیتے وقت معاملے کو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیتے۔ اقوام متحدہ کی پالیسی ہمیشہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" پر مبنی رہی اور اسلامی دنیا خصوصیت سے بے انصافی کا شکار رہی۔

اس دوران صدر ناصر نے مصر کی اقتصادی ترقی کے منصوبے تیار کئے تو امریکہ نے مالی امداد کی پیش کش کی جو ناصر نے 'ہم زنگِ زمیں دام' سمجھ کر ٹھکرا دی۔ امریکہ

نے ناصر کو ڈرا دھمکا کر بھی اپنا آلۂ کار بنانا چاہا مگر یہ ترکیب بھی کارگر نہ ہوئی۔ امریکہ نے اوچھے ہتھیار بھی استعمال کئے لیکن صدر ناصر نے مشرق سے مدد حاصل کر لی۔ روس موقع کی تاک میں تھا۔ ناصر کا اشارہ پاتے ہی اس نے مصر کو بے دریغ مدد دی اور اسوان بند کی تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔ پھر مصر کی اقتصادی حالت سدھرنے لگی۔ اس وقت تک نہر سویز سے ایک وقت میں ایک ہی جہاز گذر سکتا تھا۔ ناصر نے اس نہر میں توسیع کر کے اسے بیک وقت دو جہاز گذرنے کے قابل بنا دیا یعنی بیک وقت دو طرفہ جہاز رانی ہونے لگی جس سے نہر کی آمدنی بڑھ گئی۔

ناصر کے رجحان اور مصر کی خوشحالی سے اینگلو امریکی بلاک کو بہت تکلیف ہوئی۔ اس مغربی بلاک نے انتقامی کارروائی کے تحت مصر کے ہاتھ اسلحہ اور دیگر جنگی سامان بیچنے سے اور اقتصادی ضروریات کے لئے کسی بھی قسم کا قرضہ دینے سے انکار کر دیا۔ روس نے مصر کی یہ ضروریات بھی پوری کر دیں۔ اس طرح مصر اور اس کے حامی اشتراکی دنیا کے قریب تر جا پہنچے۔

امریکہ کے لئے یہ چوٹ معمولی نہیں تھی۔ اس نے اسرائیل کو مسلح کرنا شروع کر دیا۔ وہاں سڑکوں کا جال بچھا دیا اور ایلیہ کو جدید بندرگاہ بنا دیا۔ اپنے طور پر امریکہ ہند چینی میں الجھ گیا تھا۔ اس لئے اسرائیل کی مدد کے لئے وہ صرف رقم دیتا رہا اور ہتھیار وغیرہ برطانیہ، فرانس، مغربی جرمنی وغیرہ دیتے رہے۔ یوں اسرائیل جدید سامانِ حرب سے لیس ہوگیا۔

ادھر نہر پانامہ کے جھگڑے اور ادھر نہر سویز کے بند ہو جانے کے خطرے کے پیشِ نظر مغربی بلاک مصر کے نظام کو درہم برہم کرنے پر تل گئے۔ بحیرۂ روم میں

ان کے لئے بحری جہازوں اور فضائی اڈوں کے ختم ہونے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس لئے اینگلو امریکی بلاک کے لئے ایک ہی ٹھکانہ رہ گیا تھا جسے وہ دفاعی اڈہ BRIDGE HEAD بنا سکتے تھے، وہ تھا اسرائیل۔ انہوں نے اسرائیل کو بحری افواج کے اڈے کے علاوہ میزائل کا اڈہ بنانے کا بھی فیصلہ کر لیا۔ اس اڈے کی منصوبہ بندی برطانیہ نے بالفور کے اعلان کے تحت کی تھی۔ چنانچہ یہ کام مستعدی سے ہوتا رہا اور عرب ممالک کے حکمران اس خوش فہمی میں مبتلا رہ کر چپ رہے کہ ان چند ہزار اسرائیلی یہودیوں سے کیا خطرہ؟ ہم جب چاہیں انہیں نکال باہر کریں گے۔ لیکن عربوں کی کم فہمی کہ وہ صیہونیوں اور یہودیوں کے فرق کو نہ جان سکے اور نہ جاننے کی کوشش ہی کی۔ چنانچہ وہ اپنی تباہی کی سوچی سمجھی سازش کو پروان چڑھتا دیکھتے رہے۔

لیکن اس کم فہمی اور کوتاہ بینی کا ذمہ دار صرف عربوں کو ٹھہرانا بھی بے انصافی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ دنیا کے مسلمان ذرا گریبان میں منہ ڈال کر سوچیں کہ آیا انہوں نے بھائیوں کے فرائض ادا کرنے کی کوشش کی تھی؟ کیا دنیائے اسلام کے ہر فرد و بشر کو معلوم تھا (یا اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی؟) کہ صیہونی کون ہیں؟ اُن کے عقائد کیا اور منصوبے کیا ہیں؟ ان کی سرپرستی کون کر رہا ہے؟ اور اس خطرے کا تدارک کیا ہے؟ اسرائیل درحقیقت صرف عربوں کا نہیں بلکہ عالم اسلام کا مسئلہ تھا اور اب بھی یہ عالم اسلام کا ہی مسئلہ ہے۔

عالمی سٹریٹیجی

آج کل ایٹمی جنگ کا چرچا عام ہے۔ ایٹمی جنگ کی تباہ کاریاں انسان کے تصورات کی حدود سے بھی آگے ہیں۔ متعدد ممالک ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ہو گئے ہیں یا ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لئے اب جنگ کی باتیں کرتے عالمی سٹریٹیجی کی اصطلاح استعمال ہونے لگی ہے۔ ایٹمی دور سے پہلے جنگ مخالف ملک کی سرحد سے شروع ہوتی تھی اور آگے بڑھتی تھی لہٰذا ملک کا دفاع اس طریقہ جنگ کے مطابق کیا جاتا تھا لیکن اب جنگ مخالف ملک کے اندر سے شروع کی جاتی ہے جس سے فضائی اڈے، فوجی ٹھکانے، تیل بارود کے ذخیرے، کارخانے وغیرہ تباہ کر کے دشمن کو مفلوج کر دیا جاتا ہے جس طرح عرب اسرائیل جنگ میں ہوا اور جس طرح جنگِ ستمبر میں بھارت نے پاکستان کو تباہ کرنے کی کوشش کی مگر اپنے فضائی اڈے اور ریڈار سٹیشن پاکستانی ہوابازوں کے ہاتھوں تباہ کروا کے اقوام متحدہ میں فائر بندی کی التجائیں کرنے لگا۔

سٹریٹیجی دو قسم کی ہوتی ہے۔ پریونٹو PREVENTIVE اور پری ایمپٹو PRE-EMPTIVE۔ ان دونوں کا مقصد ایک ہی ہے۔ صرف طور طریقے مختلف ہیں۔ پریونٹو سٹریٹیجی یہ ہے کہ دو حکومتیں ایک دوسری کو وقتاً فوقتاً

متنبہ کرتی رہتی ہیں کہ "تم نے قابلِ اعتراض اور اشتعال انگیز کارروائیاں ختم نہ کیں تو نتائج کی ذمہ داری تم پر ہوگی"۔ دونو حکومتیں ایک دوسری کے خلاف جنگ کی تیاریاں کرتی رہتی ہیں اور سوچتی رہتی ہیں کہ جنگ ان کے لئے کہاں تک مفید یا نقصان دہ ہوگی اور اقوامِ عالم کا ردِّ عمل کیا ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مخالف ملک کے خلاف دوسرے ملکوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ اس طریقہ جنگ کا آغاز باقاعدہ اعلان سے ہوتا ہے۔

پری ایمپٹو سٹرائیک یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں دشمنی ہو اور حالات بگڑتے چلے جائیں تو وہ جنگ کی تیاری کرتے ہیں۔ اگر ایک ملک کو خطرہ محسوس ہو کہ اس کا دشمن شاید اس پر حملہ کر دے گا تو وہ اپنے آپ کو دشمن ملک پر اچانک حملہ کرنے کا حقدار سمجھتا ہے اور اعلان کے بغیر حملہ کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر جنوبی ویت نام میں امریکہ کو اشتراکی قبضے کا خطرہ محسوس ہوا تو اس نے اپنی اور اپنے اتحادیوں کی فوجوں کو ویت نام میں اشتراکی فوجوں کے مقابلے میں اتار دیا۔ امریکہ اسے جارحانہ کارروائی نہیں سمجھتا۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر وہ ویت نام میں جنگی کارروائی نہ کرتا تو عالمی امن خطرے میں پڑ جاتا۔ اسرائیل بھی اسی امریکی اصول کی آڑ میں عربوں کے خلاف واویلا کرتا رہا کہ عرب اسرائیل کے خلاف جنگی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اپنے ملک کے متعلق اسرائیلی حکومت نے تل ابیب سے ریڈیو اور اخباروں میں خبریں شائع کیں کہ "ہم جنگی تیاریوں سے گریز کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں جنگ کے کوئی آثار نہیں"۔ عرب بھولے بادشاہ بنے رہے اور تل ابیب سے اٹھے ہوئے جھوٹ کو سچ تسلیم کرتے رہے۔

دنیا پر ایٹمی جنگ کا خطرہ سیاہ گھٹا بن کر چھاتا چلا جا رہا ہے۔ لہٰذا دونو بلاکوں

کو ڈر ہے کہ کہیں ان کا حریف ان پر پری ایمپٹو اصول کے تحت حملہ نہ کر دے۔ چنانچہ اس خطرے سے نمٹنے کے لئے انہیں ایسے اڈوں کی ضرورت ہے جو حریف کے ملک کے قریب کے ملکوں میں یا حریف کے ساحل کے قریب بحری جہازوں پر قائم کئے جا سکیں تاکہ اچانک حملے کی صورت میں فوری طور پر جوابی حملہ کیا جا سکے۔

ہر حکومت اپنے ملک کو ایٹمی جنگ سے بچانے کی سوچتی ہے۔ اسی بنا پر فرانس نے اپنے ملک سے نیٹو کے اڈے اٹھوا کر امریکہ سے کہہ دیا ہے کہ روس جانے اور آپ جانیں۔ لیکن فرانس صرف اس وقت اس آزادانہ اقدام کے قابل ہو سکا ہے جب اس کی اقتصادی اور دفاعی پوزیشن مستحکم ہو گئی ہے۔ برطانیہ نے بھی اپنے ہاں نیٹو کے اڈے رکھنے سے انکار کر دیا ہے مگر بلجیم چھوٹا اور کمزور ملک ہونے کی وجہ سے اپنے ملک میں دوسروں کے اڈوں کو ہٹا نہیں سکتا۔

حکومتِ پاکستان نے ویت نام کی جنگ میں حصّہ نہ لینے کا جو اعلان کیا ہے، مندرجہ بالا حالات کے پیشِ نظر اس کی اہمیّت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر بھارتی حکمرانوں نے اپنے ملک میں اس لالچ کی وجہ سے غیر ملکی اڈوں کے قیام کو قبول کر لیا ہے کہ وہ اسی بہانے اپنی مسلح افواج میں جس قدر چاہتے ہیں اضافہ کر سکیں گے تو وہ شاید بھول رہے ہیں کہ وہ دوسروں کے لئے قربانی کے بکرے بھی بن رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ پاکستان کا فیصلہ ملک و ملّت کی بقا کے لئے نہایت مفید ہے۔

دلچسپ اور غور طلب امر یہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جب جاپان نے پری ایمپٹو سٹرائیک کے تحت پرل ہاربر پہ اچانک حملہ کر کے امریکی بحری بیڑے کی کمر توڑ دی تو اسے جارحانہ حملہ کہا گیا کیونکہ اتحادی جو امریکہ کے روپے پیسے

کے زور پر لڑ رہے تھے۔ امریکہ کے ہمنوا تھے مگر ویت نام میں امریکہ کی بے دریغ بمباری اور دیگر روز افزوں جنگی کارروائیاں جن میں اس ذرا سے ملک کے بے گناہ شہری بھی نیپام بموں سے جل رہے ہیں، جارحانہ نہیں بلکہ "برائے امن" ہیں۔

اسی امریکی اصول کے تحت برطانوی امریکی بلاک نے اسرائیل کے عیارانہ اور جارحانہ حملوں کی مذمت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ انہوں نے ستمبر ۱۹۶۵ میں پاکستان پر بھارت کے حملے کو بھی مدافعانہ کہا ہے۔ مغربی طاقتیں جنہیں بھارت کی پشت پناہی کرنے میں اپنا مفاد نظر آتا ہے بھارت کے اس پروپیگنڈے کو نشر کرتی رہی ہیں کہ بھارت کو پاکستان کی طرف سے خطرہ ہے۔

جس قوم کے پاس طاقت اور دولت ہو وہ اپنے جرائم دوسروں کے سر تھوپ سکتی ہے۔ یہی حال امریکہ کا ہے۔ ہٹلر نے یہودیوں کو ان کی غداری اور بے اصولی کی وجہ سے جرمنی سے نکالا، ان پر مقدمے چلائے، سزائیں دیں اور بربریت کا مظاہرہ بھی کیا۔ اس پر مغربی طاقتیں چلا اٹھیں۔ وہ آج تک ان جرمنوں پر مقدمے چلا چلا کر سزائیں دے رہی ہیں جو ان "جرائم" کے ذمہ دار تھے مگر اسی بربریت اور غیر انسانی ظلم و تشدد کا مظاہرہ اسرائیل میں عربوں کے خلاف ہو رہا ہے تو یہی مغربی طاقتیں یوں نظریں پھیرے ہوئی ہیں جیسے ان کا ان مظالم کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہٹلر کے خلاف آج بھی امریکی، برطانوی اور فرانسیسی یہی ایک بات کہتے نہیں تھکتے کہ اس نے ان کے شہریوں کو بھی نہ بخشا۔ مگر امریکہ کے نیپام بموں نے ویت نام کے معصوم بچوں تک کو جلا ڈالا تو یہ "برائے امن" سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے۔

بھارتی فوج نے پاکستان پر اچانک حملہ کیا تو یہ جارحیت نہیں تھی۔ بھارتی،

پاکستان کے سرحدی دیہات سے عورتوں اور بچوں تک کو اٹھائے گئے اور انہیں بربریت کا نشانہ بنا کر تڑپا تڑپا کر مارا تو یہ مدافعانہ کارروائی تھی۔ اس کے برعکس پاک افواج نے دفاعی حملہ کیا تو مغربی ممالک اس جھوٹ میں بھارت کے ہمنوا ہو گئے کہ پاکستان ائرفورس بھارت کی شہری آبادی پر نیپام بم پھینک رہی ہے۔

عرب کا تیل اور تیل کی جنگ

بالفور کا اعلان ۱۹۱۷ میں ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب امریکہ کی تیل کمپنیوں کو معلوم ہوا کہ عرب اور ایران کی سرزمین کے نیچے تیل کا سمندر موج زن ہے۔ پہلی جنگ عروج پر تھی اور حالات ایسے تھے جو مغربی اتحادیوں کے حق میں نہیں تھے۔ پھر بھی برطانیہ نے اپنی فوجیں فلسطین، عراق اور ایران میں بھیج دیں۔ اتحادیوں کے سامنے پہلی مہم یہ تھی کہ جرمنوں کو شکست دی جائے لیکن برطانیہ تیل کے ذخائر پر قبضے کو فوقیت دے رہا تھا۔ میں اس جنگ میں شریک تھا اور اس وقت عراق میں تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حکومتِ برطانیہ نے تیل کی خاطر کس بے دردی سے ہندوستانی اور برطانوی فوجوں کو کٹوایا تھا۔

عراق سے مجھے برطانوی کمک کے ساتھ ایران بھیجا گیا۔ وہاں بھی وجہ پیکار تیل

کے ذخائر ہی تھے جن کی خاطر جرمنی نے ترکوں سے کہا تھا کہ روس کے علاقے قفقاف پر حملہ کریں۔ چنانچہ انور پاشا نے جرمن فوج کی کمک لے کر عراق اور ایران کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ ترکوں کو شکست دینے اور عرب پر قبضہ کرنے کے لئے برطانوی فوجیں فلسطین اور درہ دانیال میں بھیجی گئیں حالانکہ جرمن یورپی میدانِ جنگ میں پیش قدمی کر رہے تھے۔ لیکن برطانیہ نے فلسطین کو اپنی پیش قدمی کا اڈہ منتخب کیا۔ یہ سارے پاپڑ عرب اور ایران BEACH HEAD کے تیل کی خاطر بیلے گئے۔

نصف صدی گذر چکی ہے۔ عرب کے ریگزاروں تلے تیل کے سمندر ابھی خشک نہیں ہوئے۔ تیل کی مانگ اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ عالمی طاقتوں کے دونو بلاک مشین کے بل بوتے پر ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس مشینی دور میں تیل کے سمندر بھی کافی نہیں اور تیل کا ایک ایک قطرہ ملکی سکّے سے زیادہ قیمتی ہے۔ مگر تیل عرب اور ایران میں ہے۔

تیل کی ضرورت کے علاوہ ملک کی اقتصادی حالات کا توازن قائم رکھنے کے لئے بیرونی ملکوں کے ساتھ تجارت ازبس لازمی ہے اور تجارت کو رواں دواں رکھنے کے لئے بری اور بحری شاہراہوں، بندرگاہوں اور فضائی اڈوں کی ضرورت ہے۔ پھر غیر ممالک میں اس اہتمام کو برقرار رکھنے کے لئے انسانوں کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسرائیلی ایک ایسی قوم نظر آئی جنہیں ایک وطن دے کر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا بالفور اعلان کے تحت اسرائیل کا قیام اس مقصد کے لئے عمل میں لایا گیا کہ تیل کے ذخائر اور نہر سویز کی پاسبانی اسرائیلی کریں گے۔ برطانیہ

کو جنگ نے کنگال کر دیا تھا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسرائیل کو اپنی نوآبادی بنانے کا منصوبہ بنالیا جس طرح برطانیہ نے آسٹریلیا کو بنایا تھا۔ ۱۹۵۶ میں جب نہر سویز کی خاطر برطانیہ نے مصر پر حملہ کر دیا تو روس نے مصر کی مدد کرنیکا اعلان کر دیا۔ یہ امریکہ کے وقار کے لئے خطرہ تھا۔ یہ خطرہ اس لئے بھی شدید ہو گیا کہ عرب ممالک اور شمالی افریقہ میں جہاں جہاں مغربی طاقتوں کے اڈے تھے، وہاں کی حکومتوں اور عوام نے ان اڈوں کے خلاف کھلم کھلا احتجاج شروع کر دیا۔

اس صورتِ حال میں مغربی بلاک کے لئے امید کی ایک ہی کرن تھی اور وہ تھی عرب ممالک کے سربراہوں کی آپس کی ناچاقی اور اختلاف رائے۔ مغربی بلاک نے اپنی خصوصی چالوں سے اسی ناچاقی کو ہوا دی اور عربوں کو دو متضاد حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ ناصر سوشلسٹ گروہ سے جا ملا اور باقی عالم اسلامی کے اتحاد کے حامل رہے۔ اس گروہ کی قیادت شاہ فیصل نے سنبھال لی۔ عرب ان ناچاقیوں سے کچھ حاصل کر سکے یا نہیں، یہ الگ بحث ہے لیکن امریکہ نے فائدہ اٹھا کر اسرائیل کو اپنا مضبوط اڈہ بنانا شروع کر دیا۔

امریکہ کو پاکستان کی طرف سے بھی چوٹ پڑی۔ وہ اس طرح کہ اس نے ۱۹۶۴ میں پاکستان کو سیٹو SEATO کا اتحادی ہونے کی وجہ سے ویت نام کی جنگ میں شریک ہونے کے لئے کہا۔ پاکستان نے نہایت موزوں جواب دیا — "سیٹو کے معاہدے کے تحت کشمیر کا قضیہ ختم کراؤ —" امریکہ بھارت کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے کشمیر کے مسئلے میں پس و پیش کی۔ پاکستان نے ویت نام کے معاملے میں اپنا مؤقف نہ بدلا اور امریکہ ناراض ہو گیا۔ اس

ناراضی کا اظہار پاکستان پر بھارتی حملے سے کیا گیا۔ اینگلو امریکی بلاک (اور روس نے بھی) بھارت کو بے پناہ جنگی قوت عطا کر رکھی تھی۔ انہوں نے اس قوت پر زرِ کثیر صرف کیا تھا جسے پاک افواج نے سرحدوں پر بھارتی آرمی کے خون میں ڈبو دیا۔ بڑی طاقتوں کو قطعاً توقع نہیں تھی کہ پاکستانی بھارتیوں کا یہ حشر کریں گے۔ انہیں پہلی بار پاکستان کی عظمت کا احساس ہوا اور یہ احساس بھی کہ پاکستان کی خفگی شدید تر ہوگئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کے دوست اسلامی ممالک بھی اینگلو امریکی بلاک سے بگڑنے لگے جس کا اثر سینٹو پر پڑا۔ امریکہ کی یہ اوچھی چال اس کے اپنے دفاعی منصوبوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ اس نے اسرائیل اور عرب ممالک پر ہی توجہ مرکوز کی کیونکہ وہ اسی خطّے سے دنیا بھر کو زد میں لے سکتا ہے۔

اس خطے کو ذرا نقشے پر دیکھیں تو اس کی جنگی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ یہاں سے روس اور چین کو آسانی سے دُور مار میزائیلوں کی زد میں لیا جا سکتا ہے۔ تاریخ میں اس خطے کی جنگی اہمیّت اور واضح ہے۔ فلسطین کی سرزمین سے ہی آنحضرت صلعم نے تبوک کے غزوہ میں مدینہ پر روما کے حملے کو روکا تھا۔ پھر آپؐ کے وصال کے بعد زید بن حارثؓ نے رومی حکومت کے حوصلے اور عزائم تہس نہس کیے تھے۔ فلسطین کی ہی سرزمین پر خالد بن ولید نے روما کی حکومت پر وادیٔ یرموک میں فیصلہ کن ضرب لگائی تھی۔

صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کو جن کا سالارِ اعظم برطانیہ کا رچرڈ تھا، اسی سرزمین پر ہی شکستوں پہ شکستیں دی تھیں۔ اسی خطّے میں ترکوں کو شکست ہوئی تھی اور خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوا تھا۔ اس خطّے نے کئی حکومتوں اور بڑے بڑے

جنگجوؤں کی قسمتیں بدل دیں۔

امریکہ اور برطانیہ بھی، اسرائیل کو مضبوط کرتا چلا گیا اور صیہونیوں کے ہاتھوں عربوں کے حقوق غصب کرواتا رہا حتیٰ کہ جون ۱۹۶۷ میں مشرقِ وسطےٰ میں جنگ کے شعلے بھڑکا دیئے۔ میں مختصر سا جائزہ پیش کرتا ہوں کہ اس جنگ سے پہلے اسرائیل کن خطوط پر جنگی تیاریاں کرتا رہا اور عربوں کا ردِ عمل کیا تھا یا کچھ تھا بھی یا نہیں۔

اسرائیلی فتنہ گُل کھلانے لگا

اپریل ۱۹۶۶ سے عربوں اور اسرائیلیوں میں کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ اکتوبر کے دوران فلسطینی مہاجر مجاہدوں نے گوریلا سرگرمیاں تیز کر دیں۔ مجاہدین کے اس جیش کا نام "الفتح" ہے۔ ۴ نومبر ۱۹۶۶ کو متحدہ عرب جمہوریہ اور شام نے باہمی دفاع کے معاہدے پر دستخط کئے۔ اسرائیل نے عربوں کے ان اندرونی معاملات اور واقعات کو اپنے اخباروں اور ریڈیو کے ذریعے خوب بڑھا چڑھا کر دنیا کے سامنے پیش کیا اور انہیں اسرائیل کے لئے خطرہ قرار دیا۔

اسرائیل نے اپنے ہی پروپیگنڈے کو جواز بنا کر ۱۳ نومبر ۱۹۶۶ کو قصبہ

سمو پر ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے اچانک حملہ کر دیا۔ اس قصبے کی آبادی چار ہزار تھی اور اس کا خاصا جانی اور مالی نقصان ہوا۔ مغرب کے اخباروں نے اسرائیل کی اس جارحانہ کارروائی کو تادیبی کارروائی کہا اور اس کا جواز یہ پیش کیا کہ اسرائیلی حکومت نے اس جنگی اقدام کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ "الفتح" کے مجاہدوں کو علم ہو جائے کہ اسرائیل تادیبی کارروائی کر سکتا ہے اور ایسی کارروائی میں حق بجانب بھی ہے بعض مغربی اخباروں نے یہاں تک اداریے لکھے کہ یہ روس کی شرارت ہے۔ اسی الزام کی تائید برطانیہ کے سابق وزیر اعظم چرچل کے بیٹے ونسنٹ چرچل نے "ڈیلی ٹیلیگراف" کے کالموں میں کی۔ ونسنٹ چرچل تل ابیب میں "ڈیلی ٹیلیگراف" کا نامہ نگار تھا۔ اس نے لکھا کہ روسی سراغرسانوں نے ناصر اور شاہ حسین کو خبر دی تھی کہ اسرائیل عربوں پر اچانک حملہ کر دے گا۔ چنانچہ عربوں نے دفاعی کارروائی کی تو اسرائیل نے ان کے قصبے پر حملہ کر دیا۔

عربوں کے پروپیگنڈے کی مشینری کمزور اور ناقص تھی۔ ان کے اخبار غم و غصہ سے لبریز ہوتے تھے مگر کسی بھی عربی اخبار نے ونسنٹ چرچل کے اس اخباری بیان کی تردید نہ کی جس میں اس نے کہا تھا کہ سرحدوں پر اسرائیل کی فوج ایک کمپنی سے زائد نہیں حالانکہ اسرائیلیوں نے ٹینکوں اور آرمرڈ کاروں سے حملہ کیا تھا۔

۱۷ اپریل ۱۹۶۷ کے روز اسرائیل نے شامیوں پر ایک اور حملہ کر دیا۔ اس حملے کے لئے یہ بہانہ تراشا (جیسے حسب معمول مغرب کے اخباروں نے سچ ثابت کیا) کہ شامی توپخانے نے "الفتح" کے مجاہدین کی مدد کے لئے اسرائیل کے

زراعتی فارموں کے ٹریکٹر ڈرائیوروں پر گولہ باری کی ہے۔ اس جھڑپ میں شامیوں کے چھ مگ طیارے تباہ ہو گئے۔ اسرائیلی بکتر بند گاڑیوں اور فوجیوں کا بھی خاصا نقصان ہوا۔ مغربی اخباروں نے اس شدید جھڑپ میں اسرائیلیوں کو مظلوم اور شامیوں کو حملہ آور قرار دیا۔

زرعی ٹریکٹروں سے مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ۱۹۵۰ میں جرمنی کا جرنیل بیرن وان لمانیتھ میرے ہاں مہمان ٹھہرا۔ میں اُسے اپنے فارم میں لے گیا۔ وہ میرے ٹریکٹروں کو بڑی غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا —— "کیا آپ کی حکومت نے بھی ہماری طرح کا منصوبہ بنالیا ہے؟" —— میں نے پوچھا کہ کیسا منصوبہ؟ تو اس نے بتایا کہ ہٹلر اپنی فوج کا بیشتر حصہ بکتر بند بنانا چاہتا تھا۔ یعنی ٹینک کوریں زیادہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے زراعتی کاموں کے لئے جو ٹریکٹر بنوائے اور ملک میں رائج کئے وہ بوقتِ ضرورت چند منٹوں میں ٹریکٹر سے ٹینک بن جاتے تھے۔ فرانس پر ہٹلر نے انہی "زرعی ٹریکٹروں" سے حملہ کیا تھا۔

میں نے اس سے کرید کرید کر پوچھا تو اس نے تفصیلات بتا دیں۔ میں نے اسے محکمہ دفاع کے سیکرٹری کے پاس بھیجا تاکہ وہ اس طریقۂ کار کو سمجھ کر حکومت کو مشورہ دے مگر ہمارے برطانوی کمانڈر انچیف اور جنرل سٹاف نے اسے چلتا کر دیا۔

جرمنوں کی طرح اسرائیل کے پاس بھی "زرعی ٹینک" تھے جو زراعتی فارموں میں ٹریکٹروں کے روپ میں کام کرتے رہتے تھے۔ عرب جاسوس یہ چال نہ سمجھ سکے۔

مصر کے دوست بھارت کا کردار غور طلب ہے۔ مصر کی سرحد پر اقوام متحدہ کی جو نگران افواج متعین تھیں ان میں بیشتر کینیڈا اور بھارت کی تھیں۔ ان بھارتی فوجی

افسروں نے بھی مصر کو صحیح صورت حال سے بے خبر رکھا۔ برطانیہ کے اخبار "ڈیلی ٹیلیگراف" نے مصر اور بھارت کی اس "دوستی" کا خوب مذاق اڑایا تھا۔

۱۶ مئی ۱۹۶۷ کو مصر کے چیف آف سٹاف جنرل فوزی نے بھارتی جرنیل ریکھی کو اس مضمون کا تار دیا ——— "میں آپ کو بذریعہ تار اطلاع دے رہا ہوں کہ میں نے متحدہ عرب جمہوریہ کی افواج کو حکم دے دیا ہے کہ اگر اسرائیل کسی بھی عرب ملک کے خلاف جارحانہ کارروائی کرے تو اس پر جوابی حملہ کر دیا جائے۔ میں نے اس مقصد کے لئے اپنی فوجوں کو سینائی کی مشرقی سرحدوں پر جمع کر دیا ہے۔ دریں حالات میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ کی افواج نے جو نگران چوکیاں قائم کی ہیں۔۔۔ آپ انہیں خالی کر کے اپنے دستوں کو واپس بلا لیں تاکہ آپ کا کوئی جانی نقصان نہ ہو۔ میں نے اس محاذ پر اپنے متعلقہ کمانڈر کو مطلع کر دیا ہے"۔

بھارتی جنرل ریکھی نے فوراً اقوام متحدہ میں اوتھان کو اطلاع دے دی اور اوتھان نے اعلان کر دیا کہ اقوام متحدہ کی نگران افواج کو پیچھے ہٹ جانے کا حکم دے دیا گیا ہے۔

۱۷ مئی ۱۹۶۷ کو مصر کے وزیر خارجہ نے ان سات ممالک کے سفیروں کو جن کے دستے اقوام متحدہ کی نگران فوج میں شامل تھے، اپنے ہاں بلا کر صدر ناصر کے مندرجہ بالا فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ ۱۸ مئی ۱۹۶۷ کی دوپہر کو مصری فوج نے شرم الشیخ پر قبضہ کر لیا۔ یہ گاؤں مصر کا ہی تھا لیکن وہاں اقوام متحدہ کی نگران افواج کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ان افواج کے چلے جانے پر اس گاؤں میں مصری فوج کو ہی متعین ہونا تھا۔ اس طے معمول کے مطابق کارروائی سے اسرائیل کو نقصان پہنچا کیونکہ

اقوام متحدہ کی نگران فوج کے ایماء پر اور تحفظ میں اسرائیل خلیج عقبہ میں جہاز رانی کر رہا تھا۔ اسی طرح ایلیہ کی بندرگاہ بھی، جو دراصل عربوں کی تھی، امریکہ کی پشت پناہی میں ۱۹۵۶ میں اسرائیلی قبضے میں چلی گئی تھی۔ اب مصری فوجوں نے ان اپنے ہی مقامات پر اپنی فوجیں بھیجیں تو اینگلو امریکی بلاک کے پریس اور ریڈیو نے واویلا بپا کر دیا کہ یہ جارحانہ اقدام ہے۔

مشہور مفکر اور فلسفی کارلائیل نے کہا تھا ــــ "جائز حق کس بلا کا نام ہے؟ وہ تمام حقوق جائز ہیں جنہیں تم بزورِ شمشیر اپنے لئے جائز بنالو۔ تاریخ میں ایسی مثالیں لاتعداد ہیں۔"

اینگلو امریکی بلاک نے اسی فلسفے پر عمل کیا اور اسرائیلیوں کے لئے بھی یہی فلسفہ جائز قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ خلیج عقبہ کو اسرائیل ایک عرصے سے استعمال کر رہا ہے لہٰذا یہ اسی کی ملکیت ہے۔

۲۲ مئی ۱۹۶۷ کو صدر ناصر نے خلیج عقبہ اور آبنائے تیران کو اسرائیلی جہازوں کے لئے اور دوسری اقوام کے ایسے جہازوں کے لئے بھی بند کر دیا جو اسرائیل کے لئے اسلحہ اور جنگی سامان لے جاتے تھے۔ یہ ایک دفاعی اقدام تھا اور بالکل جائز۔

۲۳ مئی ۱۹۶۷ کو اسرائیلی وزیرِ اعظم اشکول نے اعلان کر دیا کہ آبنائے تیران کی ناکہ بندی اسرائیل کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ عالمِ اسلام کو اس بات پر ذرہ بھر حیران نہیں ہونا چاہئے کہ اسی روز امریکہ کے صدر جانسن نے بھی اشکول کی ہمنوائی کی اور مصر کے فیصلے کو ناجائز قرار دیا۔ وہی صدر جانسن، جس نے عربوں پر اسرائیلی

مظالم کو ہمیشہ نظر انداز کیا تھا۔ اسرائیل کی ہمنوائی میں اپنے حریف روس کے وزیر اعظم کوسیجن سے بھی یہ استدعا کرنے سے نہ جھجکا کہ مصر کے اقدام کے خلاف اسرائیل کے مؤقف کو تسلیم کیا جائے اور اس سلسلے میں امریکہ کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ دونوں ملکوں کی اخباری اطلاعات کے مطابق دونو سربراہوں (جانسن اور کوسیجن) کے درمیان فون پر باتیں ہوئیں لیکن یہ پتہ نہ چل سکا کہ باتیں کیا ہوئیں۔

۲۴ مئی ۱۹۶۷ کو اسرائیل کا وزیر خارجہ ایبان پیرس اور لندن سے ہوتا ہوا جانسن سے ملنے واشنگٹن پہنچا۔ جانسن کوسیجن سے فون پہ بات کر کے کینیڈا کے وزیر اعظم لیسٹر پیئرسن سے ملنے چلا گیا۔ جانسن کی اس بھاگ دوڑ سے پتہ چلتا ہے کہ اسرائیل کے ساتھ امریکہ کی کئی امیدیں وابستہ تھیں اور اسرائیل کی خاطر امریکہ حق و انصاف کے تقاضوں کو بھی فراموش کر چکا تھا۔ یہ وہی امریکہ ہے جو امن عالم کی رکھوالی کا دعویدار ہے۔

۲۶ مئی ۱۹۶۷ کو اسرائیلی وزیر خارجہ ایبان جانسن سے ملا اور اسے ۵۷ وعدے یاد دلائے جو اس نے یکم مارچ ۱۹۵۷ کو اس وقت کی اسرائیلی وزیر خارجہ مسز گولڈا میئر سے کئے تھے۔ ۱۹۵۷ میں ایبان واشنگٹن میں سفیر تھا۔ ان تحریری وعدوں کے مسودے پر فاسٹر ڈلیس کے کچھ نوٹ لکھے ہوئے تھے۔ جانسن اور ایبان میں ۸۵ منٹ تک بحث اور بات چیت ہوئی۔ ایبان نے جانسن کو یہ بھی یاد دلایا کہ جب فاسٹر ڈلیس نے اسرائیل کو یہ دھمکی دی تھی کہ اگر اسرائیل نے شرم الشیخ کو خالی نہ کیا تو امریکہ تادیبی کاروائی کرے گا تو جانسن نے کہا تھا کہ میری دلی آرزو ہے کہ اسرائیل کا نیلا اور پیلا پرچم نیلے آبنائے تیران پر ہمیشہ لہراتا رہے۔

امریکی سفیر گولڈ برگ نے (جو نسلاً صیہونی ہے) اور ٹامس، سفیر برطانیہ نے (جو اسی روز ماسکو سے واپس آیا تھا) جانسن کو تسلی دی کہ گو روسی وزیر اعظم کوسیجن نے اتفاق رائے یا اشتراک عمل کا وعدہ نہیں کیا تاہم آثار ایسے ہیں کہ روس عربوں کی حمایت میں اسرائیل کے خلاف میدان میں نہیں آئے گا۔

برطانیہ کا وزیر اعظم ہیرلڈ ولسن بھی ایران کے پیچھے پیچھے جانسن اور کینیڈا کے وزیر اعظم سے ملنے کے لئے واشنگٹن جا پہنچا اور ان ممالک کے اخباروں نے ولسن کے اس پروگرام کو "اتفاق" اور "عام ملاقاتوں کے سلسلے کی ایک کڑی" لکھا۔ جانسن اور ولسن ایسے مسودے کی تیاری میں مشغول تھے جس کے تحت اسرائیل اور عرب کی جنگ کو روکا جا سکے۔ اس مسودے کی تکمیل میں تاخیر ہو گئی کیونکہ دونو سربراہوں نے فیصلہ کیا کہ دوسری بڑی طاقتوں سے کہا جائے کہ وہ مصر کو نہر سویز اور خلیج عقبہ کی ناکہ بندی ختم کرنے کو کہیں ورنہ طاقت استعمال کی جائے گی۔ مصر کو گمراہ کیا گیا کہ وہ روس کی مدد پر بھروسہ نہ کرے۔

۲۷ مئی کو ناصر نے اس دھمکی کا جواب ان الفاظ میں دیا—

"اس دفعہ ہماری جنگ کا واحد مقصد اسرائیل کا نام و نشان مٹانا ہوگا۔ اس جنگ میں ہمارا دشمن اکیلا اسرائیل نہیں امریکہ اور برطانیہ بھی ہوں گے۔ ہمارا دشمن نمبر ایک امریکہ ہے اور برطانیہ اس کا باج گذار اتحادی ہے"۔

مغرب کے اخباروں کے لئے یہ بیان پروپیگنڈے کے لئے بڑے کام کا تھا۔ انہوں نے ناصر کے اس بیان کو دنیا میں نشر کیا اور کہا کہ ناصر کے عزائم جارحانہ

ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ مغربی بلاک فکرمند بھی ہوا۔ جانسن نے اپنے خصوصی ایلچی کی معرفت ناصر کو رات ساڑھے تین بجے جگا کر پیغام دیا کہ صبر و تحمل سے کام لیں اور جنگ میں پہل نہ کریں۔ اسی رات روسی سفیر نے کوسیجن کی ترجمانی کرتے ہوئے ناصر کو جنگ میں پہل نہ کرنے کو کہا۔

جانسن یوں تو ناصر کو جنگ سے روک رہا تھا لیکن ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہ اپنا اور برطانیہ کا بحری بیڑہ بحیرۂ روم میں حرکت میں لے آیا۔ اس پر روس نے بھی اپنا بیڑہ بحیرۂ روم میں بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور درّہ دانیال سے اپنے بحری جہاز گذارنے کے لئے ترکی سے اجازت مانگی۔ ترکی نے اجازت دے دی۔ یہ امر خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ روس کے بیڑے کو درّہ دانیال سے گذر کر بحیرۂ روم میں جانے کی اجازت ۱۹۳۶ کی "مانٹریو کنونشن" کے بعد یعنی تیس برس بعد ملی تھی۔ ترکی کی اجازت سے ظاہر ہو گیا کہ نیٹو کا اتحادی ہونے کے باوجود ترکی مغربی بلاک کا ساتھ نہیں دے گا۔

عرب اسرائیل تصادم

جون ۱۹۶۷

روس کا بحری بیڑہ ۲۰ مئی ۱۹۶۷ کو بحیرۂ روم میں پہنچ گیا۔ اسی دن مصر

کے اخبار "الاہرام" نے خبر چھاپی کہ ایک امریکی ٹینکر (تیل بردار جہاز) جس پر لائبیریا کا جھنڈا لہرا رہا تھا، خلیج عقبہ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا تو اسے واپس بھیج دیا گیا۔ اسی روز شاہ حسین صدر ناصر سے ملنے قاہرہ پہنچ گئے ناصر اور حسین کے اتحاد نے مغربی بلاک کو چونکا دیا کیونکہ اس سے اسرائیل پر اردن کی سمت سے بھی حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ خبر عرب دنیا کے لئے امید افزا اور مغربی بلاک کے لئے پریشان کن تھی۔ اس بلاک نے اس اتحاد کو یوں پروپیگنڈے کے لئے استعمال کیا کہ وہاں کے اخباروں نے اداریے لکھے جن میں واویلا مچایا کہ اسرائیل کے پاس فوج ناکافی ہے اور اس کی فوج کے دس میں سے آٹھ سپاہی باقاعدہ ملازم نہیں بلکہ کاشت کار ہیں کیونکہ اسرائیل کی مالی حالت ایسی اچھی نہیں کہ وہ باقاعدہ فوج رکھ کر تنخواہ، راشن اور دیگر ساز و سامان مہیا کر سکے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اسرائیل نے اپنے قابل ترین جرنیل موشے دایان کو ۱۹۵۶ میں پنشن پر بھیج دیا تھا۔ اس طرح خوب پروپیگنڈا کیا گیا اور اسرائیل کو ایک کمزور ملک ثابت کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ عرب اسرائیل کی جنگی قوت سے بے خبر رہیں۔ خود عربوں نے کسی حد تک اس پروپیگنڈے کو قبول کر لیا۔

ہر چند کویت، سعودی عرب، لبنان، سوڈان، شام اور الجزائر نے عربی اتحاد اور اسرائیلیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا تاہم ان کی فوجیں حرکت میں نہ آ سکیں۔ ان کے پاس کوئی ایسی تیز ٹرانسپورٹ ہی نہیں تھی۔ اس دشواری کے علاوہ ان میں سے کئی ممالک میں امریکی اور برطانوی فوجی مشن ابھی موجود تھے، جیسے ابتداءً پاکستان میں بھی تھے۔ یہ مشن من مانی کرایا کرتے تھے۔ پاکستان میں ان کا کردار یہی رہا ہے۔

انہی غیر ملکی مشنوں کی وجہ سے برصغیر میں فرقہ وارانہ خونریزی ہوئی اور انہی کی بدولت کشمیر کی جنگ ہوئی بھی اور رکی بھی۔ میں اس غیر ملکی دخل اندازی اور اپنے ملک کی دفاعی کمزوری کا عینی شاہد ہوں۔

یہی فوجی مشن کئی مسلمان ممالک میں موجود تھے اور جنگی پالیسیوں کی باگ ڈور مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ انہوں نے مسلمان ملکوں کی افواج کو بروقت حرکت نہ کرنے دی اور نہ فیصلہ ہی کرنے دیا کہ جنگ کی صورت میں انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ ان مشنوں کا ایک اور نقصان یہ ہوا کہ جن ملکوں میں وہ موجود تھے وہاں کی دفاعی پالیسی صیغۂ راز میں رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ روز بروز واشنگٹن اور لندن کو پتہ چل رہا تھا کہ مسلمان ممالک میں کیا ہو رہا ہے۔ اس طرح اسرائیل بھی پوری طرح باخبر تھا۔ اس کے برعکس عرب ممالک اسرائیل کے اندر کی باتوں سے بالکل بے خبر تھے۔

۳۱ مئی ۱۹۶۷ کو اسرائیلی حکومت کی کونسل نے پری ایمپٹو سٹرائیک کے تحت عربوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مغربی اخبارات یہی کچھ لکھتے رہے کہ صدر ناصر اور شاہ حسین کے اتحاد اور معاہدے نے اسرائیل کو جنگی تیاری پر مجبور کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل نہ صرف از خود شروع سے ہی جنگی تیاریاں کر رہا تھا بلکہ مغربی بلاک اسے اپنے ہاتھوں بہت بڑی جنگی قوت اور جنگ پسند قوم بنا رہا تھا کیونکہ وہ اس قوم کو شکاری کتے کی طرح استعمال کرنا چاہتا تھا۔ ان تیاریوں کے تحت اسرائیلی فوج کے محکمۂ سراغرسانی SECRET INTELLIGENCE SERVICE کے انچارج ایلن کو عرب ممالک کی فوجی قوت، نقل و حرکت، ان کے فوجی اور فضائی ٹھکانوں کا پوری طرح علم تھا۔

اسرائیلیوں کی اس جاسوسی کی تصدیق "ڈیلی ٹیلیگراف" اور چند ایک اور مغربی اخباروں نے بھی کی تھی۔ بعض نے یہاں تک لکھا کہ امریکہ کا رسوائے عالم ادارہ سی آئی اے اسرائیل کو پوری طرح باخبر رکھتا رہا ہے۔ اس انکشاف کے باوجود مغربی بلاک یہود نوازی میں لکھتے رہے کہ اسرائیل جنگ نہیں کرنا چاہتا۔ وہ تو مجبوری کے تحت صرف دفاعی جنگ لڑے گا۔ اسی لئے وہ اپنی فوج کو حرکت میں لا رہا ہے۔ اس کے برعکس عربی اور مشرقی اخبار محض لاف زنی کرتے رہے۔ مثلاً یہ کہ ہم اسرائیل کا نام و نشان مٹا دیں گے وغیرہ۔ اگر وہ اسلام کے اس حکم کو سامنے رکھتے۔ "اپنے دشمن کو جانو، اپنے آپ کو پہچانو" تو وہ اسرائیل کا نام و نشان فی الواقع مٹانے کے قابل ہو جاتے۔

"ڈیلی ٹیلیگراف" کے اداریے کے مطابق اسرائیل کو جنگ سے پہلے یقین ہو گیا تھا کہ جنگ کی صورت میں امریکی حکومت اس کی پشت پناہی کرے گی۔ نیز یہ بھی کہ روس مداخلت کرنے کی بجائے خاموش تماشائی بنا رہے گا۔ یہ یقین اُسے اپنے محکمہ جاسوسی نے دلایا تھا اور امریکی حکومت نے بھی کچھ ایسا ہی اشارہ کیا تھا۔

اسرائیل نے اپنے فوجی اور جنگی امور کو نہایت خوبی سے چھپائے رکھا اور کوئی بڑ نہ ماری۔ اس کے برعکس عرب اخبار اپنے فوجی افسروں کی نقل و حرکت اور فوج کے متعلق خبریں بڑے فخر سے شائع کرتے رہے، جس سے اسرائیلی جاسوسوں کا کام اور زیادہ سہل ہو گیا۔ اس بے احتیاطی کے علاوہ قاہرہ اور دوسرے عرب ملکوں کے دارالخلافوں میں مغربی سیاحوں کی بھرمار تھی۔ ان میں جاسوس اور سراغرساں بھی تھے۔ سیاحت پر کوئی پابندی نہ لگائی گئی۔

عربی اخباروں نے مصر کے جنرل ریاض کے دورۂ اردن اور اسکی سرگرمیوں کی تفصیلات بھی شائع کیں جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسرائیلی جاسوسوں نے صحیح رپورٹ تیار کرلی کہ عراق کی فوج کے ہراول میں ایک سو (۱۰۰) ٹینک ہیں اور یہ بکتر بند دستہ ۴ جون ۱۹۶۷ کو دریائے اردن پار کرکے مغربی کنارے پر آجائیگا اور عراق کی باقی فوج کی تیاری جون کے وسط میں مکمل ہوجائے گی۔ اور یہ بھی کہ اسرائیل کے عقب میں، تل ابیب کے قریب عراق کے تقریباً چار سو (۴۰۰) ٹینک ہوں گے۔ عرب ہائی کمان کا اپنے جنگی راز کی حفاظت نہ کرنا شیخی کا نتیجہ ہے یا جنگ کے تقاضوں سے لاعلمی کا مظہر۔

عرب ہائی کمان نے اور لغزش یہ کی کہ اُن کے چار مگ طیاروں نے اسرائیلی علاقوں پر پرواز کرکے تصویریں لیں۔ یہ اقدام جنگ کا انتہائی ضروری اقدام ہوتا ہے جس کے بغیر فوجوں کے لئے جنگی کاروائی دشوار ہوجاتی ہے۔ عربوں نے اپنے اس اقدام کو بھی خوب نشر کیا۔ اس کا ایک نقصان تو یہ ہوا کہ ان کے دشمن نے اپنی فوجوں کے عارضی ٹھکانوں کو بدل ڈالا۔ دوسرا انہوں نے یہ اعتراف کر لیا کہ انہوں نے اسرائیلی علاقے میں جاکر فضائی خلاف ورزی کی ہے۔ اسرائیل اور مغرب کے اخباروں نے اسے اشتعال انگیزی کہہ کر دنیا پہ ثابت کردیا کہ عرب اسرائیل کو جنگ پہ اُکسا رہے ہیں۔

یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ امریکہ اور برطانیہ کے صفِ اول کے ساٹھ فیصد اخباروں اور جرائد کے مالک صیہونی ہیں اور صدر جانسن کے اعلیٰ مشیروں میں چار صیہونی ہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا کہ اسرائیل کے خلاف کوئی بات اخباروں میں

آجائے۔ اس کے علاوہ اسرائیلیوں کی احتیاط کا یہ عالم رہا کہ ان کا وزیر جنگ موشے دایان اسرائیل کے کونے کونے میں گیا۔ فوجیوں کے ہر ٹھکانے اور شہریوں کے ہر ادارے میں جا کر اس نے سب کو جوش دلایا اور یہ یقین دلایا کہ ان کی بری اور بحری فوج عربوں کو جوابی وار کرنے کی مہلت ہی نہیں دے گی۔ اس نے سب کو بتایا کہ اسرائیلی ایئر فورس عربوں اور مصر کی ایئر فورس کو پہلے ہی روز ناکارہ کر کے اپنے ملک کو بمباری کے خطرے سے بچالے گی۔ موشے دایان نے سارے ملک میں جا کر اپنی قوم کے حوصلے بلند کئے۔ جنگی پوزیشنوں کو بھی دیکھا لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اسرائیل کے کسی اخبار یا ریڈیو نے اشارہ تک نہ کیا کہ ان کا وزیر جنگ کیا کر رہا ہے۔

۳ رجون ۱۹۶۷ کو دایان چند ایک مغربی اخباروں کے نمائندوں سے غیر رسمی طور پر ملا اور تجاہل عارفانہ سے بولا ــــ "آپ جنگ کا ذکر کر رہے ہیں؟ میری فوج کو دو ہفتوں سے صحرا میں موبلائیز MOBILIZE کیا جا رہا ہے۔ اس کے سامنے دو اعلان ہیں، ایک یہ کہ 'جنگ نہیں ہوگی' اور دوسرا یہ کہ 'جنگ لڑی جائے'۔ میرے فوجی ترجمان مجھے بتا رہے ہیں کہ میری فوج کے لئے 'جنگ نہیں ہوگی' والا اعلان زیادہ قابلِ قبول ہے" ــــ جنرل دایان کو جنگ کے دیوتاؤں کا پجاری تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ صرف قابل جرنیل ہی نہیں بلکہ جنگ پسند بھی ہے۔ اس کے منہ سے جنگ کے خلاف یہ اکتایا ہوا سا بیان سن کر سب حیران ہوئے لیکن انہوں نے یہ خبر چھاپ دی کہ "اسرائیل جنگ کا خواہاں نہیں"۔

اسی روز دایان نے اخباری رپورٹروں کو بلایا۔ وہ اسے وزیر دفاع کی

حیثیت سے پہلی بار مل رہے تھے۔ دایان نے انہیں بیان دیا — "مجھے اسرائیل کی حکومت میں پہلی بار شامل کیا گیا ہے۔ میری شمولیت سے پہلے حکومت نے یہ طے کیا تھا کہ ہمارے لیے کوئی دفاعی منصوبہ تیار کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ ہم درۂ تیران کی ناکہ بندی کے متعلق مصر کے آخری فیصلے کا انتظار کر رہے ہیں۔ حکومت نے یہ مسئلہ ڈپلومیٹک ذرائع سے حل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لیے ہمیں آخری فیصلے کا انتظار کرنا ہوگا۔"

جنرل دایان نے کمال چالاکی سے اخباروں میں یہ تاثر شائع کروا دیا کہ ہم تو جنگ سے ڈرتے ہیں اس لئے ہم کسی پرامن حل کا انتظار کریں گے، خواہ کتنی ہی دیر کیوں نہ لگ جائے۔ دایان کے اس بیان کو ونسنٹ چرچل اور رینڈولف اور فرانسیسی صحافی امیر کیوا ڈ نے تمام مغربی اخباروں میں رنگ آمیزیوں سے شائع کیا۔ حد یہ ہے کہ پاکستانی اخباروں میں بھی یہ خبر ان الفاظ سے شائع ہوئی —— "اسرائیل میں مکمل طور پر امن و سکون ہے۔ اسرائیلی فوجی ہفتے کی شام سے اپنے گھروں کو رخصت ہو گئے ہیں۔ بعض اپنے فارموں میں اور بعض سمندر کے کنارے شام گذارنے چلے گئے ہیں۔ یہ جگہیں ایسی ہیں جہاں عربوں کی فوجیں اُن پر آسانی سے گولیاں برسا سکتی ہیں۔" —— نامہ نگاروں نے یہاں تک لکھا کہ اسرائیلی محکمہ سنسر نے نامہ نگاروں کو یہ پہلی اجازت دی ہے کہ وہ یہ خبر اپنے اپنے ملک کے اخباروں کو بھیج سکتے ہیں اور یہ بھی کہ —— "ہم نے دایان کی پریس کانفرنس میں عرب کا ایک جاسوس بھی دیکھا تھا لیکن اُسے کسی نے کچھ نہ کہا۔"

ایک طرف اسرائیل کے متعلق یہ خبریں شائع ہوئیں اور دوسری طرف عرب

لیڈروں کی اشتعال انگیز تقریریں شائع ہوئیں۔ جس روز یہ خبریں دنیا بھر کے اخباروں میں شائع ہوئیں اس روز اسرائیل جون ۱۹۶۷ کی جنگ کی تیاری مکمل کر چکا تھا۔ یہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اپنے عزائم کی پردہ پوشی میں اسرائیل اکیلا نہیں تھا۔ اینگلو امریکی بلاک کی پروپیگنڈہ مشینری اس کی مدد کے لئے وقف تھی۔

میں نے دو عالمگیر جنگوں میں پروپیگنڈے کے کرشمے دیکھے ہیں۔ میں نے وائرلیس سیٹ جام ہوتے دیکھے ہیں اور دشمن کے وائرلیس سیٹ جام کروائے بھی ہیں۔ دشمن کے گمراہ کن پیغام سنے بھی ہیں اور دشمن کو غلط پیغاموں سے گمراہ کیا بھی ہے۔ ۱۹۴۰ میں فرانس کی شکست فاش اور جرمنوں کی طوفانی یلغار سے اتحادیوں کی پسپائی، جس کی یادگار ڈنکرک کے نام سے تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گی، دراصل جرمنوں کی طاقت کا کم اور ان کے پروپیگنڈے کا زیادہ کرشمہ ہے۔ جرمنوں نے اتحادیوں کا وائرلیس سسٹم جام کر کے ان کی فوجوں اور فرانس کے شہریوں کو گمراہ کن پیغام دیئے تھے جن سے نہ صرف شہریوں اور سپاہیوں میں ہڑبونگ مچی بلکہ برطانوی اور فرانسیسی جرنیلوں تک نے اس قسم کے احکام دیئے کہ ہتھیار پھینک دو اور بھاگو۔ میں بھی اس پسپائی میں شریک تھا۔ جب مجھے ایک برطانوی جرنیل نے ہتھیار پھینک کر بھاگنے کا حکم دیا تو مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ آج عربوں کا مذاق اڑانے والے انگریزوں کے جرنیلوں کو میں نے کل ہتھیار اور ایمونیشن پھینک کر گیدڑوں کی طرح بھاگتے دیکھا ہے۔

عرب اسرائیل جنگ میں یہی کچھ ہوا۔ مغربی بلاک کے اخبار اسرائیل کی جنگی

تیاری پر ان کے لیڈروں کے گمراہ کن بیان چھاپ چھاپ کر پردہ ڈالتے رہے۔ پھر مصر کے وائرلیس سسٹم کو جام کیا گیا۔ اس کے بعد مصری ہوابازوں کو ان کی زبان میں غلط پیغام دے کر بہکایا گیا۔ ۵ جون ۱۹۶۷ کے روز جب مصری عوام کو جنگ کے متعلق سوچنا چاہئے تھا اور اس آنے والی صورتِ حال کے لئے تیاری اور بچاؤ کی ترکیب کرنی چاہئے تھی، وہ معمول کے مطابق اپنے کام کاج میں مصروف رہے کیونکہ اخباروں نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ اسرائیل پُراسن حل کا منتظر ہے۔

قاہرہ کے کلبوں، ہوٹلوں اور تفریح گاہوں میں رقص و سرود جاری تھا۔

اور اسرائیل کی فوج جنگی پوزیشنوں میں پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ جب اسرائیلی ہوابازوں نے قاہرہ کے ہوائی اڈہ پر پہلا حملہ کیا تو مصر کے اکثر ہواباز سوئے ہوئے تھے۔ یہی حال اردن اور شام کا تھا۔ مصر کے بعض ہوائی اڈوں پر دشمن کو گمراہ کرنے کے لئے نقلی DUMMY ہوائی جہاز بھی رکھے ہوئے تھے۔ یہ اسرائیل کے جاسوسوں کا کمال ہے کہ انہوں نے ان نقلی جہازوں کی نشاندہی کی اور اسرائیلی ہوابازوں نے ان ڈمیوں کو چھوا تک نہیں۔

برطانوی ریڈیو کا کردار خاص طور پر غور طلب ہے۔ ۵ جون ۱۹۶۷ کی صبح کو اسرائیلی حملے سے چند گھنٹے پہلے، بی بی سی نے یہ خبر نشر کی کہ یمن سے اطلاع ملی ہے کہ مصری ہوابازوں نے پھر یمن کے ایک گاؤں کے مردوں، عورتوں اور بچوں پر نیپام (آتشیں) بم گرائے ہیں۔

یہ غلط خبر نشر کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ عربوں پر اسرائیلی نیپام بمباری سے دنیا کی توجہ ہٹائی جائے۔ جب اسرائیل نے نہتے شہریوں پر نیپام بم گرائے تو

نہ بی بی سی نے کوئی خبر نشر کی نہ کسی دوسرے مغربی ریڈیو نے کچھ کہا۔ یہ تھا مغرب کا کردار عربوں کے خلاف۔

۵ رجون ۱۹۶۷ کو اسرائیلی ہوائی فوج نے پہلے ہی وار میں مصری ہوائی بیڑے کو منفلوج کر دیا۔ جنگی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو جنگ چند منٹوں میں ختم ہو چکی تھی۔ مسلم ممالک اور دنیا بھر کے مسلمان محض خوش فہمیوں میں مبتلا رہے اور اس انتظار میں کہ مصر اور عربی ممالک اسرائیل کا نام و نشان مٹا دیں گے۔ پیشتر اس کے کہ وہ کسی ایک محاذ پر عربوں کی معمولی سی بھی جنگی کامیابی کی کوئی خبر سنتے یہ خبر آئی کہ عرب مات کھا گئے ہیں۔

پھر کرۂ ارض کے گرد ایک ہی آواز منڈلانے لگی "عرب شکست کھا گئے"۔ جب یہ آواز پاکستان میں پہنچی تو پاکستانی پریس نے بھی اسی آواز کو نشر کرنا شروع کر دیا۔ پھر "عرب اسرائیل جنگ" اخباروں اور رسالوں کا مستقل موضوع بن گیا۔ کالم بھرنے کے لئے ایسے ایسے کالم نویس اور ادیب اس نازک موضوع پر لکھنے لگے جنہیں فنِ حرب اور عرب اسرائیل تصادم کے پس منظر اور پیش منظر کے متعلق کچھ بھی علم نہ تھا۔ چنانچہ ہمارے ہاں اس قسم کی فضا پیدا ہو گئی کہ سرکاری طور ہم عربوں کے ہمدرد بنے رہے اور صحافی طور پر ہم ان کے خلاف مغربی بلاک کی عرب دشمن صحافت کی نقل کرتے رہے۔ حد یہ کہ دو تین اخباروں نے یہودیوں کے دو بین الاقوامی شہرت یافتہ امریکی ہفت روزہ جرائد "ٹائم" اور "نیوز ویک" میں چھپی ہوئی خبروں اور تبصروں کو من و عن ترجمہ کر کے چھاپ دیا۔

میں ذاتی طور پر تسلیم کرتا ہوں کہ عرب یہ اعلان تو اٹھتے بیٹھتے دہراتے رہے

کہ ہم اسرائیل کا نام و نشان مٹا دیں گے لیکن اس عزم کے لئے جن جنگی تیاریوں کی ضرورت ہوتی ہے ان کی طرف انہوں نے توجہ نہ دی۔ اس کے برعکس اسرائیلی عربوں کے اعلان سے چوکنے رہے اور اپنا نام و نشان باقی رکھنے کے لئے ہر لمحہ تیاری کرتے رہے بلکہ ان کی اقتصادی اور دفاعی پالیسیاں اسی ایک مقصد کے تحت بنتی رہیں۔

یہاں مجھے ایک فرانسیسی جرنیل مارشل فوچ کا قول یاد آتا ہے۔ اس نے کہا تھا "فاتح جرنیل ہر لحاظ سے قابل ترین جرنیل تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا ہر قول و فعل قابلِ ستائش ہوتا ہے مگر شکست خوردہ جرنیل کو ہر طرح کی لغزشوں کا مجرم قرار دے دیا جاتا ہے"۔

اسرائیل کی اس بیداری کے علاوہ مغربی بلاک جس طرح اس فتنے کی پرورش کرتا رہا اسے میں تفصیلاً بیان کر آیا ہوں۔ یہ جنگ درحقیقت عربوں اور اسرائیلیوں کی نہیں بلکہ عربوں اور مغربی بلاک کی تھی جس میں اسرائیل کی حیثیت ایک ہتھیار کی تھی۔ مغربی بلاک کا آلۂ کار بننے میں چونکہ اسرائیل کو اپنی عافیت نظر آتی تھی اس لئے اس نے مغربی بلاک کی مدد امداد کے علاوہ اپنے طور پر اپنے آپ کو طاقتور بنانے کی پوری کوشش کی۔ اس کے برعکس عرب روس پر بھروسہ کئے بیٹھے رہے اور انہوں نے اپنے نفاق کو بھی مٹانے کی کوئی کوشش نہ کی اور اس سے مغربی بلاک فائدہ اٹھا گیا۔

آئیے، اب ذرا جنگ کا جائزہ لیں۔

عرب کیوں ہار گئے؟
تفصیلی تجزیہ

اسرائیل کی فضائی فوج کا کمانڈر انچیف کرنل ہڈ تھا جسے اس جنگ میں کامیابی کے صلے میں بریگیڈیئر بنا دیا گیا ہے۔ جنگ کے خاتمے پر مغربی اخباروں کے نمائندوں اور نامہ نگاروں نے ہڈ کو مبارک باد دی اور اس سے اپنی کامیابی کا راز پوچھا تو اس نے انہیں تفصیلاً بتایا کہ ــــ

۱۔ ہم نے اس جنگی منصوبے کی تیاری میں سولہ (۱۶) برس صرف کئے تھے اس منصوبے کی بنیاد یہ تھی کہ مصریوں اور عربوں کے ہوائی بیڑے کو صرف اسی (۸۰) منٹوں میں تباہ کرنا ہے اور پہلے ہی وار میں تباہ کرنا ہے۔ یہ عزم ہمارے اعصاب پر اس حد تک چھا گیا تھا کہ ہم اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، اسی ایک عزم کی تکمیل پر بحث کرتے اور سوچتے رہتے تھے۔ شاید ہی کوئی لمحہ ہوگا جب یہ عزم ہمارے حکام بالا اور ہوابازوں کی سوچ اور فکر سے نکلا ہو۔

۲۔ ہم نے سراغرسانی اور جاسوسی پر خصوصی توجہ دی۔ ابتدا ہی سے ہم دشمن کی نقل و حرکت، ہوائی بیڑے میں تبدیلیوں، اضافے اور ہر ردّ و بدل کو جاسوسوں کے ذریعے ریکارڈ کرتے رہے۔ اس کے مستقل ہوائی اڈوں کو ہم نے ذہن نشین کر لیا اور

فاصلے اور حملے کی سمت اور زاویے طے کرتے رہے۔ دشمن کے طیاروں کی ذرا ذرا سی نقل و حرکت کا بھی ہمیں پتہ چلتا رہا اور ہم فیصلہ کرتے رہے کہ دشمن کس مقام پر کتنے طیارے رکھنا چاہتا ہے اور یہ طیارے کس انداز سے ہوائی اڈے پر رکھے جاتے ہیں۔

ہمارا دوسرا اہم ہدف (ٹارگیٹ)، دشمن کا ریڈار تھا۔ ہم نے معلوم کر لیا کہ ان کے ریڈار کس قسم کے ہیں، کہاں کہاں ہیں، وہ کتنے فاصلے تک سراغرسانی کر سکتے ہیں اور انہیں کس ترکیب سے جام کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے اپنے میزائیلوں کے اڈوں کے متعلق بھی یہ سوچا کہ ان کی حفاظت کے لئے کیا اہتمام ضروری ہے اور یہ عربوں کے کون کون سے علاقے تک مار کر سکتے ہیں۔ ہم نے دشمن کے مجوزہ میزائیل اڈوں کا بھی سراغ لگا لیا۔

ہم نے اپنے طور پر کی ہوئی جاسوسی کا موازنہ جب امریکی سراغرساں ادارے سی آئی اے کی سراغرسانی سے کیا تو ہماری جاسوسی بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ سی آئی اے نے ہماری سراغرسانی کی تصدیق کر دی۔

۳۔ اپنے جاسوسوں اور سی آئی اے کی رپورٹوں کے مطابق ہم دشمن کے ہوائی بیڑے کی تنظیم میں تبدیلیوں کو دیکھتے ہوئے اپنے ہاں بھی تبدیلیاں کرتے چلے گئے اور اپنے دفاعی منصوبے میں بھی ردوبدل کرتے رہے۔

۴۔ ہم نے اس منصوبے کو اس حد تک صیغۂ راز میں رکھا کہ اپنے ہوابازوں کو بھی اس سے آگاہ نہ کیا۔ ہم ان کی تربیت اسی ایک بنیاد پر کرتے رہے کہ اتنی منٹ میں دشمن کی ایئر فورس کو تباہ کرنا ہے۔

امن کے زمانے میں جب ہواباز فضائی فائرنگ، راکٹ یا بمباری کی مشق کرتے

ہیں تو ان کی ستر یا اسی فیصدی صحیح فائرنگ کو کامیاب تسلیم کیا جاتا ہے لیکن جنگ میں اگر وہ ۲۵ فیصد تک صحیح فائرنگ کر آئیں تو ہم اسے کامیابی سمجھتے ہیں کیونکہ جنگ میں جب ہوا باز دشمن کے علاقے پر حملہ کرنے جاتا ہے تو اسے دشمن کی طیارہ شکن توپوں اور مشین گنوں کے علاوہ دشمن کے طیاروں کا بھی سامنا ہوتا ہے۔ اسے اپنی جان کی حفاظت کے ساتھ طیارے کو بھی خیریت سے واپس لانا پڑتا ہے۔ اس خطرے اور جلدی میں اگر وہ ۲۵ فیصد بم یا راکٹ ٹھکانے پر مار آئے تو ہم اسے اس کا کامیاب حملہ کہتے ہیں۔

لیکن اس جنگ میں ہمارے ہوابازوں کی کامیابی ۲۵ فیصد سے بہت زیادہ رہی۔ یہ ہماری ٹریننگ اور کامیاب جاسوسی کا کرشمہ ہے۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہوابازوں نے دشمن کی تباہی میں ذاتی دلچسپی بھی لی۔ ہم اپنے ہوابازوں کو فضائی حملے کی مشق جنوبی نجف کے صحرا میں کراتے رہے ہیں۔ ہم اصلی ایمونیشن سے مشق کراتے رہے اور یہ جائزہ بھی لیتے رہے کہ ایک اڑان میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے۔ یعنی ہوباز کے اڈے سے اڑنے سے لیکر بم وغیرہ گرا کر واپس آنے اور طیارے میں از سر نو تیل اور ایمونیشن ڈالنے تک کتنے منٹ لگتے ہیں۔ ہم اس وقت کو کم کرتے چلے گئے اور سولہ سال صرف کر کے اپنے فضائی بیڑے کو اس قابل بنا دیا کہ ہوباز اسی (۸۰) منٹ میں دشمن کو تباہ کر کے واپس آ جائیں۔

ٹریننگ کے ساتھ ساتھ ہوابازوں کے جوش و جذبہ کو بھی ہم ابھارتے رہے اور ان کے دلوں میں اپنے وطن کے لئے جان کی قربانی دینے کا جذبہ پیدا کرتے رہے۔ فضا میں ہی نہیں ہم زمین پر کام کرنے والوں کو بھی اسی طرح کی

ٹریننگ دیتے رہے۔ اپنے تارگیٹ پر سات اور دس منٹ کے عرصے میں پہنچنا اور ۲۴ گھنٹوں میں کم و بیش پانچ سو اڑانیں SORTIES کرنا ہمارے ہوابازوں اور گراؤنڈ سٹاف کی قابلیت اور پھرتی کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ اسرائیلیوں کے ڈائریکٹر آف اپریشن ویزمین نے بھی اخباری نمائندوں کو اپنے فضائی حملوں کی کامیابی کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ:

۱۔ جاسوسوں کے علاوہ ہم مختلف ہوائی اڈوں سے اپنے طیاروں کو دشمن کے علاقے پر بہت ہی زیادہ بلندی پر اڑان کر کے یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجتے رہے کہ دشمن کہاں کہاں مستقل یا عارضی فضائی اڈے بنا رہا ہے۔ جاسوسی کی ان اڑانوں سے ہم یہ اندازہ بھی لگاتے رہے کہ ہمارے ہواباز اپنے کون سے اڈے سے دشمن کے کون سے اڈے تک کتنے منٹوں میں پہنچ سکتے ہیں اور کتنے منٹوں میں واپس آکر تیل اور ایمونیشن ڈلوا کر دوسری اڑان کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔

۲۔ جب ہم نے خلیج عقبہ اور درّۂ تیران کی ناکہ بندی کے خلاف ناصر سے احتجاج کیا تو ہم نے اُسے دھوکہ دینے کے لئے اپنے طیاروں کی اڑانوں کا رُخ اسی طرف کر دیا۔ پھر ہم دشمن کا ردِّعمل معلوم کرتے رہے۔ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے کیونکہ عربوں کو یقین ہو گیا تھا کہ ہم خلیج عقبہ کی حفاظت پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ لہٰذا مصر نے پہلی غلطی یہ کی کہ اپنے بہت سے طیارے ہوگاڈا کے ہوائی اڈے پر جمع کر دیئے اور طیاروں کی کچھ تعداد العریش بھیج دی۔

۳۔ عام طور پر بڑی اور فضائی حملہ صبح کاذب کی تاریکی میں کیا جاتا ہے۔ کیونکہ تاریکی حرکات کو چھپانے میں مدد دیتی ہے اور دشمن کی غفلت کی بھی امید ہوتی ہے۔ ہم نے

اپنی بڑی فوج کی پیش قدمی رات بھر جاری رکھی لیکن فضائی حملہ سحر کے وقت نہ کیا تاکہ دشمن یہ نہ جان سکے کہ ہم بڑی حملہ بھی کرنے والے ہیں۔ اُدھر ہم نے عربوں کو یقین دلا دیا تھا کہ ہم جنگ میں پہل نہیں کریں گے۔ میدانِ جنگ میں ہم نے بڑی فوج کی نقل و حرکت اُن سے پوشیدہ رکھی۔ اسی لئے ہم نے فضائی حملہ نہ کیا تاکہ دشمن یہ نہ جان جائے کہ ہم بڑی حملے کو فضا سے کور کر رہے ہیں۔

۴۔ ہم عرب ہوابازوں کی اڑانوں کا جائزہ بڑی غور سے لیتے رہے۔ ہم نے مشاہدہ کیا کہ وہ صبح صادق کے وقت مشاہداتی اڑان کرتے رہتے ہیں تاکہ ہم ان پر اچانک حملہ نہ کر دیں۔ ہم نے دیکھا کہ ہر صبح ان کا وقت ایک ہی ہوتا تھا۔ اڑان کے بعد وہ جا کر خبر دیتے کہ کوئی خطرہ نہیں۔ اس اطلاع سے ان کے تمام ہواباز اپنے کوارٹروں یا میس میں چلے جاتے۔ یہ ان کی روزمرہ کی غفلت ہوتی تھی جو اُن کا معمول بن گیا۔

جون کے آغاز تک ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ صبح ساڑھے سات بجے (قاہرہ کے وقت کے مطابق ساڑھے آٹھ بجے) عرب ہواباز مصدقہ طور پر کہہ دیتے تھے کہ فضا صاف ہے اور حملے کا کوئی خطرہ نہیں۔

ہم نے یہ یقین اپنے طور پر ہی نہیں کیا بلکہ سی آئی اے (امریکی ادارۂ سراغرسانی) سے تصدیق بھی کروالی تھی۔ ہمارے بعض جاسوس سی آئی اے سے مل کر کام کرتے تھے۔ ان کی رپورٹوں کی روشنی میں ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہمارے لئے ہوائی حملے کا وقت قاہرہ ٹائم کے مطابق ساڑھے آٹھ بجے صبح موزوں ہے۔

یہ وقت اس لئے بھی موزوں تھا کہ ہمارے ہوابازوں کو آرام کے لئے پوری رات میسر آسکتی تھی اور وہ علی الصبح تر و تازہ ڈیوٹی پر آسکتے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے کا وقت اس لئے بھی مناسب نظر آیا کہ اس وقت مصر کے لوگ اپنے کام کاج میں مصروف ہو چکے ہوتے ہیں اور ان کے ہوابازفضا کو صاف سمجھ کر غفلت میں پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ۵ رجون ۱۹۶۷ کو قاہرہ کے وقت کے مطابق آٹھ بجکر پینتالیس منٹ پر ہم نے ہوابازوں کو اس حملے کے لئے بھیج دیا جس کے لئے ہم سولہ (۱۶) برسوں سے تیاری کر رہے تھے۔

۵۔ یہ حملہ تو ہم نے عرب ہوابازوں کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کیا۔ ساتھ ہی ساتھ ہم نے دشمن کو یہ دھوکہ بھی دیا کہ ہم فضائی اور تری حملہ ایلیہ کی بندرگاہ کی طرف سے کریں گے لیکن ہم نے بالکل الٹی سمت یعنی شمال کی طرف سے حملہ کیا۔ گو اس سمت ہمارے سامنے کچھ دشواریاں بھی تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ امریکی، برطانوی اور روسی بحری جہاز راستے میں کھڑے تھے۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران برطانیہ نے ایک آلہ تیار کر لیا تھا جسے الیکٹرانک کونٹر میشر۔ ELECTRONIC COUNTER MEASURE کہتے ہیں (اس کا مخفف ای۔سی۔ایم ہے) اس کے استعمال سے دشمن کے ہوابازوں کو گمراہ کیا جاتا تھا۔ برطانیہ نے اس کے استعمال کے لئے ایک صیہونی (یہودی) سے کام لیا تھا۔ یہ صیہونی جرمنی سے بھاگا ہوا برطانیہ آیا تھا۔ اسکی مادری زبان جرمن تھی۔ وہ اس آلے کی مدد سے جرمنی کے حملہ آور ہوابازوں کو جرمن زبان میں گمراہ کن پیغام دیا کرتا تھا جیسے جرمن ہوابازاپنے ہیڈ کوارٹر یا فارمیشن کے

لیڈر کا پیغام سمجھ بیٹھتے تھے۔ اسی آلے کی مدد سے جرمنوں کے وائرلیس کو جام کر دیا جاتا تھا۔

اب یہ صیہونی اسرائیل میں آباد تھے۔ ان میں سے کئی ای سی ایم کے استعمال کے ماہر تھے اور عربی زبان عربی لب و لہجے میں بول سکتے تھے۔ انہوں نے برطانیہ سے ای سی ایم حاصل کر لئے جس سے انہوں نے عرب ہوابازوں اور ان کی بڑی فوج کے کمانڈروں کو خوب گمراہ کیا۔

ویزمین نے اخباری نمائندوں کو بتایا :

۶۔ اسرائیلی حملے سے پہلے اسرائیل کے ہواباز بہت بلندی پر مشاہداتی پرواز کیا کرتے تھے جس سے عرب واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ریڈاروں کو اسی زاویے پر لگائے رکھا مگر وہ بھول گئے یا شاید انہیں علم نہ تھا کہ جب ہوابازحملے کے لئے جاتے ہیں تو وہ دشمن کے ریڈار سے روپوش رہنے کے لئے پچاس فٹ سے بھی کم بلندی پر پرواز کرتے ہیں۔

(پاک بھارت جنگ کے دوران جب پاک فضائیہ کے شاہباز پاک فوج کی مدد کو جاتے تھے تو دشمن گھنے درختوں تلے چھپ جاتا تھا۔ چنانچہ کئی شاہباز درختوں کی بلندی سے بھی نیچے، حد یہ کہ دس فٹ تک نیچے چلے گئے اور اوپر اٹھ کر دشمن کی ڈھکی چھپی پوزیشنوں پر فائرنگ کی)

اسرائیلی ہوائی بیڑے کا منصوبہ یہ تھا کہ ان کے ہواباز سمندر کی لہروں سے تیس فٹ بلندی پر پرواز کرتے عربوں کے تمام اڈوں پر بیک وقت حملہ کریں گے۔ اسرائیلیوں

کو جن اڈوں پر حملہ کرنا تھا وہ یہ تھے :

ربیر گائیفگا، ربیر تھادا، جبل لبنی، ابوسوئیر، دیورسوئیر، فرید قبریت، المنصورہ، انچاس، جمالی، قاہرہ مغرب، قاہرہ انٹرنیشنل، ہلوان، بنی سوئیف، المینیا، لکسر، راس نباس اور ہور گادا۔

العریش کے ہوائی اڈے کے متعلق اسرائیلی ہوابازوں کو ہدایت دی گئی کہ وہاں صرف طیاروں کو تباہ کیا جائے، "رن وے" محفوظ رہے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ ۶ جون ۱۹۶۷ کو اسرائیل کی بری فوج نے العریش پر قبضہ کر لیا اور اسرائیلی ہوابازوں نے عربوں کے اس اڈے کو عربوں کے خلاف استعمال کیا۔

۷۔ اسرائیلیوں کو خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ روسی ریڈار ان کے فضائی حملے کی پیش از وقت اطلاع دے دیں گے مگر برطانیہ کے ای سی ایم نے اسرائیلیوں کی بہت مدد کی اور اس سے عربوں کو گمراہ کیا گیا۔ اس کا اعتراف شاہ حسین نے ایک انگریزی ماہانہ جریدے "فلائٹ" کے نامہ نگار جان بنٹلے کو انٹرویو دیتے ہوئے ان الفاظ میں کیا ہے کہ معلوم نہیں ۵ جون ۱۹۶۷، صبح پونے آٹھ بجے (قاہرہ ٹائم پونے نو بجے) ہمارے تمام کے تمام ٹیلی ویژن اور ریڈار بیکار کیوں ہو گئے تھے؟

معلوم ہوتا ہے کہ روسی ریڈار عربوں کے لئے دانستہ استعمال نہ کئے گئے۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ امریکی اور برطانوی بیڑے کی موجودگی بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے اور یہ بھی کہ روسیوں کو شاید علم ہی نہیں تھا کہ مصریوں کے ریڈار جام کر دیئے گئے ہیں۔ بہرحال روسیوں کا کردار معمہ ہی بنا رہا ہے۔

۸۔ جنرل ویزمین نے کہا کہ جون کی جنگ سے چند ماہ پہلے امریکی سٹاف کالج کے بہت

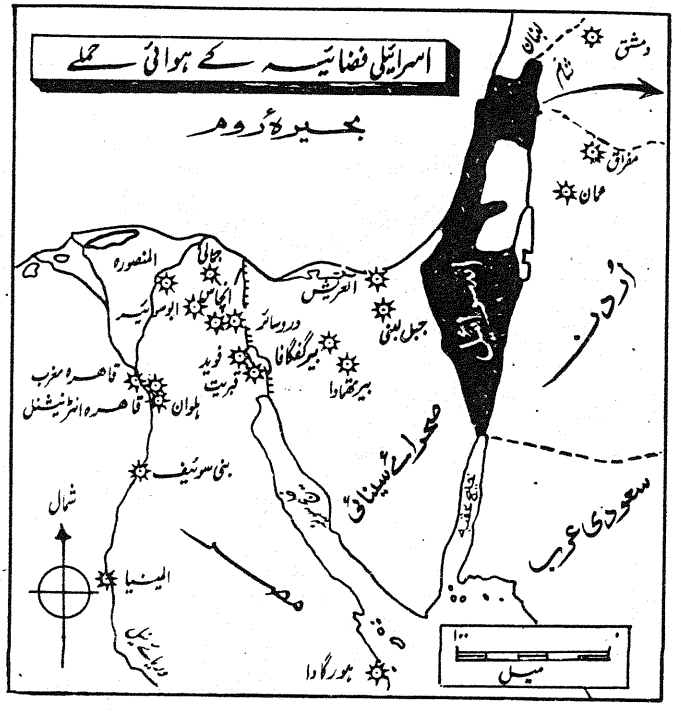

اسرائیلی فضائیہ کے ہوائی حملے
بحیرہ روم
دمشق
شام
لبنان
مفراق
عمان
اردن
اسرائیل
سعودی عرب
صحرائے سینائی
مصر
العریش
جبل لبنی
بیرگفگافا
بیرتمادا
دروسائر
فوید
قبریت
المنصورہ
ابوسوئیر
قاہرہ مغرب
قاہرہ انٹرنیشنل
حلوان
بنی سوئیف
المنیا
ہورگادا
شمال
میل
۱۰۰

اسرائیلی ہوائی اڈہ
حملہ
۲۲ منٹ
واپسی ۲۰ منٹ

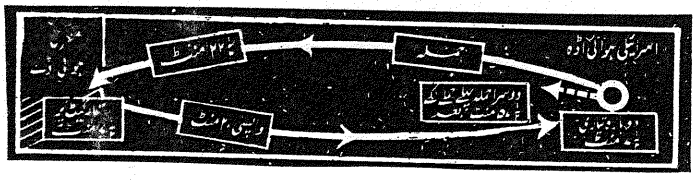

سے انسٹرکٹر ایب آئے تھے۔ ہم نے انہیں اپنی ایئر فورس کی راکٹ فائرنگ دکھائی تو وہ ہمارے ہوابازوں کی نشانہ بازی سے بہت متاثر ہوئے بلکہ بعض افسر حیران بھی ہوتے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اب اسرائیل اپنے ہوائی بیڑے پر فخر کر سکتا ہے۔

۹۔ جنرل دیزین نے بتایا کہ ہم نے عربوں کو اپنی چند حرکات سے یہ دھوکا دیا کہ ہم اُن کے بحری بیڑے کو اپنی نسبت زیادہ طاقت ور سمجھتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں۔ جب مصر نے خلیج عقبہ کی ناکہ بندی کا اعلان کر دیا تو ہم نے چند ایک لینڈنگ کرافٹ LANDING CRAFT (جن پر ٹینک وغیرہ دریا یا سمندر سے پار لے جاتے ہیں) ایسے وقت بڑی گاڑیوں پر لاد کر ایلیہ کے قریب پہنچا دیئے جب پَو پھٹنے والی تھی۔ یہی وہ وقت ہوتا تھا جب مصری ہوابازمشاہداتی اُڑان کے لئے آیا کرتے تھے۔ ہم لینڈنگ کرافٹ کو گاڑیوں سے اتار کر جوڑنے لگتے تھے۔ مصری ہوابازوں کو یہ دھوکہ ہوا (اور یہی ہمارا مقصد تھا) کہ ہم رات بھر لینڈنگ کرافٹ لاتے رہے ہیں اور اب جوڑ رہے ہیں۔ ہم نے رات کے وقت کھولنے اور صبح کے وقت جوڑنے کے عمل کو ہر روز دہرایا تو ہم عربوں کو یہ دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئے کہ ہم بری فوج کا حملہ شرم الشیخ کی بجائے جنوب مغرب سے کریں گے۔

عربوں کو یہ علم ہی نہ ہو سکا کہ ہم ہر روز انہی چند ایک لینڈنگ کرافٹ کو بار بار کھول اور جوڑ رہے ہیں جنہیں پہلے روز لائے تھے۔ پھر ہم نے ایک رات وہاں نقلی DUMMY لینڈنگ کرافٹ کھڑے کر دیئے اور انہیں اس ڈھنگ سے چھپایا کہ عرب دیکھ لیں۔ اس کے جواب میں عرب ہائی کمان نے چند ایک بحری جہاز اس طرف بھیج دیئے تاکہ حملے کے وقت ان لینڈنگ کرافٹ کو (جو دراصل نقلی تھے)

تباہ کر دیا جائے۔ وہ جان نہ سکے کہ ہم حملہ کس طرف سے کریں گے۔ اس طرح ہم نے مصر کی بحریہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

جنرل ویزمین اور ہرٹزوگ کے ان بیانات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسرائیل سولہ برسوں سے جنگی تیاریاں کر رہا تھا اور اس کے لیڈروں کے یہ بیانات (جو اینگلو امریکی اخباروں میں شائع ہوتے رہے) کہ انہیں عربوں نے جنگ کے لئے مجبور کیا تھا کسقدر گمراہ کن تھے۔ ان دو ذمہ دار اسرائیلی افسروں نے یہ اعترافات بھی کر لیا ہے کہ امریکہ کا محکمۂ سراغرسانی سی آئی اے اُن کی مدد کرتا رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسرائیلیوں کا جنگی منصوبہ سولہ برس نہیں پچاس برس پُرانا ہے۔

یہاں میں ان قارئین کے لئے جو فنِ حرب سے واقف نہیں یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اسرائیلیوں کی جنگی چالیں کسی خصوصی قابلیت کا پتہ نہیں دیتیں، نہ انہوں نے جنگی چالوں میں کسی نئی یا انوکھی چال کا اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے دو چالوں سے فائدہ اٹھایا ہے ـــــ ایک فریب کاری اور دوسری سی آئی اے ـــــ اس کے مقابلے میں پاکستان کی سولہ سو میل لمبی سرحدوں پر لڑی جانے والی سترہ روزہ جنگِ ستمبر کو سامنے لائیے۔ انڈین آرمی کے اکیس ڈویژنوں نے پاکستان پر اچانک حملہ اس حال میں کیا کہ پاکستانی آرمی کے انتہائی محدود دستے سرحدوں پر تھے مگر کھُدے ہوئے مورچوں یا پختہ بنکروں میں نہیں تھے۔ سرحدوں پر صرف رینجرز تھے جو چھوٹے ہتھیاروں سے لیس تھے۔ بھارت کے ایک ایک بریگیڈ کے مقابلے میں پاک فوج کی ایک ایک بٹالین اور ایک ایک بھارتی بٹالین کے مقابلے میں پاک بٹالین کی ایک ایک پلاٹون تھی حملہ صبح کاذب کی تاریکی میں آرٹلری کی گولہ باری کے بغیر کیا گیا تھا تاکہ

سرحدی چھاؤنیوں میں پاک فوج کے دستے بیدار نہ ہو جائیں۔ جب پاک فوج کی محدود نفری نے حملہ روک لیا تو انڈین آرمی نے ہر محاذ پر ڈویژنل آرٹلری (یعنی اڑھائی تین سو توپیں فی ڈویژن) سے قیامت خیز گولہ باری شروع کر دی۔ اوپر سے لڑاکا بمبار طیاروں نے حملہ آور بھارتیوں کو آتشیں چھاتہ مہیا کر دیا۔ اس کے باوجود دشمن کے حملہ آور ٹروپس بی آر بی نہر کے اُس طرف والے کنارے تک نہ پہنچ سکے۔

پاکستان ایئر فورس نے بروقت دشمن کے فضائی اڈوں کے فاصلے اور زاویے ناپے بغیر دن کے پچھلے پہر پٹھانکوٹ، ہلواڑہ، آدم پور اور جمّوں کے فضائی اڈوں کا صفایا کر دیا اور جنگ کا پانسہ ہی پلٹ ڈالا۔ پھر انہوں نے دشمن کا کونسا اڈہ سلامت رہنے دیا تھا؟ بھارت کے دو سب سے بڑے ریڈار، امرتسر اور دوارکا کے پرخچے اڑا دیئے۔ دوارکا پاک بحریہ کا پہلا اور آخری ٹارگیٹ تھا، جسے تباہ کر کے دشمن کی کمر توڑ دی گئی تھی۔

یہ حقیقت کس سے پوشیدہ ہے کہ پاک فضائیہ کے ہوابازوں کے لئے امریکہ کی سی آئی اے نے جاسوسی نہیں کی تھی؟ یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنی جاسوسی کا ایسا جال دشمن کے ملک میں پھیلا ہوا نہیں تھا بشرقی پاکستان پر انڈین ایئر فورس کے طیارے حملہ کرنے آئے تو بے دھڑکا نہ بمباری کر کے چلے گئے۔ پاک فضائیہ کے ہوابازان کے پیچھے پیچھے گئے اور کلائی کنڈہ کے ہوائی اڈے پر ان تمام طیاروں کو بھسم کر آئے۔ ہمارے شاہبازوں کا یہ کمال کسی قسم کی جاسوسی کا کرشمہ نہیں۔ البتہ بھارتی ہوابازوں کو اس کے اپنے اور اس کے دوست ملکوں کے جاسوس پاکستان کے اندر سے

راہنمائی کرتے رہے ہیں۔

پاک فوج، بحریہ اور فضائیہ کے کارنامے ... کسی فریب کاری اور سولہ برسوں کی جاسوسی کا کرشمہ نہیں تھے۔ اسرائیلی اپنے ملک میں بیٹھ کر اپنے کارنامے پر فخر کر سکتے ہیں لیکن ان کا کارنامہ کسی پہلو بھی عالمی ریکارڈ نہیں کہلا سکتا۔ اسرائیلی ہوا بازوں کی قلعی تب کھلتی جب فضا میں ان کا سامنا حریف کے طیاروں سے ہوتا۔ پاکستان ایئر فورس کے تین تین شاہبازوں نے انڈین ایئر فورس کے بارہ بارہ اور چودہ چودہ ہوا بازوں (اور اپنے سے تیز تر اور برتر طیاروں) کا مقابلہ کیا ہے۔ ذرا غیر ملکی اخباروں کے ستمبر ۱۹۶۵ کے پرچے دیکھ لیجئے تو معلوم ہو گا کہ کونسے فضائی معرکے میں کس کے زیادہ طیارے گرے تھے۔

میں بھارت کے دوست ممالک کے صرف ایک ایک اخبار میں چھپی ہوئی خبروں کے اقتباس پیش کرتا ہوں۔

امریکہ کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ہفت روزہ جریدے "نیوز ویک" کا جنرل ایڈیٹر ایوزیٹ جی مارٹن، ۲۰ ستمبر ۱۹۶۵ کے شمارے میں لکھتا ہے ــ "فوجی مبصرین ایک بات خاص طور پر نوٹ کرتے ہیں کہ بھارتی جنگ کے ابتدائی دنوں میں اپنی بری فوجوں کی امداد کے لئے فضائی طاقت کا کوئی مؤثر استعمال نہ کر سکے۔ اس کے برعکس پاکستانیوں کی یہ کیفیت ہے کہ انہوں نے بالکل صحیح وقت کا اندازہ کر کے انبالہ کے ہوائی اڈے پر جھپٹا مارا اور کم و بیش پچیس بھارتی طیاروں کو بھسم کر ڈالا۔ یہ طیارے ابھی ابھی اترے تھے اور اس حالت

میں اترے تھے کہ ان میں تیل ختم تھا اور وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے بھاگ بھی نہ سکتے تھے۔

ایک ہفتہ ختم ہونے کے بعد جنگ کی صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستانیوں نے اپنے آپ کو سنبھال ہی نہیں لیا بلکہ وہ دشمن کا گلہ بھی دبوچنے لگے ہیں۔

لندن کے مشہور و معروف اخبار "آبزرور" کا وقائع نگار پیٹرک سیل' ۱۲ ستمبر ۱۹۶۵ کی اشاعت میں محاذ کا آنکھوں دیکھا حال ان الفاظ میں بیان کرتا ہے ـــــ "فضائی جنگ میں پاکستان کی کامیابی کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی نسبتاً قلیل التعداد بری فوج کو محاذِ جنگ پر اس مشاقی سے پھیلایا ہے کہ کم سے کم نقصان سے وہ زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کر سکے ..... پاکستان ایئر فورس کے ہوابازوں نے جس جرأت اور بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے وہ ان نوجوان اور فرض کی لگن سے سرشار برطانوی ہوابازوں کی یاد تازہ کرتی ہے جنہوں نے دوسری جنگِ عظیم میں برطانیہ کو سخت کڑے وقت میں نازی حملہ آوروں سے بچایا تھا۔"

یاد رہے کہ یہ خراجِ تحسین ان ممالک کے اخباروں نے پیش کیا ہے جنہوں نے پاکستان کے خلاف بھارت کو مسلح کیا اور پاکستان پر حملہ کرنے کے لئے اسکی پشت پناہی کی تھی۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ انگلو امریکی بلاک کے صفِ اول کے بیشتر جرائد اور اخبارات یہودیوں کی ملکیت ہیں یا سرمائے کی بدولت اُن کے زیرِ اثر۔

لیکن پاکستان کے اردو اخباروں کا مغربی پروپیگنڈے کا اثر قبول کر لینا ناقابلِ فہم ہے۔ مغربی بلاک گوریلا جنگ سے خائف ہے۔ اس خیال کے پیشِ نظر کہ عرب ممالک اسرائیل کے خلاف گوریلا جنگ شروع کر دیں گے (جو انہوں نے کر بھی دی) مغربی اخباروں نے عربوں کی حوصلہ شکنی شروع کر دی اور اس قسم کے اداریے اور تبصرے لکھنے لگے کہ مسلم ممالک گوریلا جنگ لڑنے کے اہل نہیں نہ ہی ان کا علاقہ گوریلا جنگ کے لئے موزوں ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ گوریلا جنگ کی چالوں کی تربیت اور مشق کے لئے کم و بیش سولہ برسوں کی محنت کی ضرورت ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ پاکستان کے بعض اخباروں نے مغرب کے اس حوصلہ شکن اور تخریبی پروپیگنڈے کو اپنے کالموں کی وساطت سے خوب نشر کیا اور اس طرح اسرائیلی محاذ کو مضبوط بنانے کی ناپاک کوشش کی۔

تاریخ گواہ ہے کہ گوریلا جنگ مسلمانوں کی ہی اختراع ہے اور اس فنِ حرب کے بانی رسول اکرم صلعم ہیں۔ آپؐ نے دو سال کے قلیل عرصے میں ماہر ترین گوریلا لڑاکے تیار کر لئے تھے۔ اس فن کو صلاح الدین ایوبیؒ نے اپنایا اور صلیبیوں کے لئے قیامت بپا کئے رکھی۔

ماؤزے تنگ نے بھی اپنی گوریلا جنگ اسلامی گوریلا جنگ کے اصولوں پر لڑی تھی۔ ویت نامیوں کا انداز بھی اسلامی ہے۔ الجزائر نے بھی ان اصولوں پر ہی جنگ لڑی اور فتح پائی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے عرب بھائی کامیاب نہ ہو سکیں۔

صحرائے سینائی کی بکتر بند جنگ

جنگوں میں صحرائی جنگ مشکل ترین تسلیم کی جاتی ہے کیونکہ صحرا کے فریب جنگی سکیموں کو تہہ و بالا کر ڈالتے ہیں۔ سینائی کا صحرا خصوصیت سے دشوار گذار اور فریب کار ہے۔ مختلف ادوار میں اچھے اچھے کمانڈروں نے فیصلہ کہہ دیا تھا کہ سینائی کو عبور کرنا فوجوں کے بس کی بات نہیں۔ میں سینائی کی دشواریوں اور خطرناکیوں کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ البتہ اتنا بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ صلیبی کئی بار صلاح الدین ایوبیؒ کے مقابلے میں اس صحرا میں آئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ایوبی کو اس ظالم ریگزار میں پیاسا مار دیں گے لیکن وہ اس ریگزار میں جب بھی آئے ایوبیؒ کے ہاتھوں بری طرح پٹ گئے اور اللہ کا یہ شیر ہر بار سینائی کی ریت صلیبیوں کی آنکھوں میں جھونک کر سینائی کے اس کنارے سے اس کنارے تک دندناتا رہا۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران جب انگریز ترکوں کے خلاف معرکہ آرا تھے تو وہ اس صحرا کو پار کر کے ترکوں کے عقب میں جا پہنچے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں اطالوی جرنیلوں نے سینائی سے ملتے جلتے لیبیا کے صحرا کو ناقابلِ گذر سمجھا مگر اتحادی اس سے گذر گئے۔ افسوس ہے کہ مصری فوج کے کمانڈر انچیف عامر نے ٹینکوں اور بکتر بند

گاڑیوں کے باوجود سینائی کو دشوار گذار ریگزار سمجھ لیا۔

اسرائیلی فوج کے آرمرڈ کور (ٹینک کور) کے جنرل ٹل نے جنگ کے بعد کہا تھا کہ مصری فوج کو توقع تھی کہ اسرائیلی ۱۹۵۶ء کی جنگ والے راستوں کو استعمال کریں گے۔ چنانچہ مصریوں نے تمام شاہراہوں پر بارودی سرنگیں بچھا دی تھیں مگر انہوں نے بعض راستوں پر اس لئے سرنگیں نہیں بچھائی تھیں کہ وہ ان راستوں کو اسرائیلیوں کے لئے دشوار گذار سمجھتے تھے حالانکہ غیر فوجی لوگ انہی راستوں سے ادھر ادھر آیا جایا کرتے تھے۔ یہ راستے جدید دور کی کسی بھی فوج کے لئے دشوار گذار نہیں تھے اور ہمارے جاسوسوں نے ہمیں بتا دیا تھا کہ یہ راستے بارودی سرنگوں سے صاف ہیں۔

سینائی کے جنوبی حصے کو بھی مصریوں نے اسرائیلیوں کے لئے دشوار گذار سمجھا تھا مگر جاسوسی کے فقدان کی وجہ سے مصریوں کو پتہ نہ چل سکا کہ اسرائیلیوں نے حملے کا منصوبہ انہی راستوں کے مطابق بنایا ہے۔

جنرل ٹل نے کہا کہ میرے ذمے یہ کام تھا کہ میں خان یونس کو فتح کر کے رافہ کو فتح کروں اور وہاں سے العریش پر قبضہ کروں۔ جنرل یافی کو بیر لحفان پر قبضہ کرنے کا حکم ملا تھا جہاں سے اُسے جبل لیبانی کے درّے پر قابض ہو کر مصریوں کی کمک اور رسد کو کاٹنا تھا اور پیشقدمی بھی کرنی تھی۔ جنرل شیران کو یہ فرض سونپا گیا تھا کہ جنرل ٹل اور یافی سے رابطہ قائم رکھ کر مزید تعاون کے لئے نتسانہ اور اس کے بعد ابو اخیلا پر قابض ہو جائے۔ جنرل شیران کے ذمے یہ کام بھی تھا کہ مصریوں کو دھوکہ دینے کے لئے ایک بریگیڈ گروپ سے کنتیلا کے جنوب کی طرف سے چکر

کاٹ کر نخل پر قبضہ کرے۔ منصوبے کے مطابق اُسے نخل پر دو جانب سے حملہ کرنا تھا تاکہ اسرائیلی فوج کا جانی نقصان کم ہو۔ نخل پر قبضے کے بعد شیران کو متیلا پر قبضہ کرنا تھا جہاں سے مصری فوج کی نقل و حرکت کو ختم کیا جا سکتا تھا۔ مصری فوج کو پسپا کر کے شیران کو ہزسویز کی جانب پیشقدمی کرنی تھی۔

جیسا کہ میں تفصیلاً بتا چکا ہوں، ۵ جون ۱۹۶۷ کی رات تک اسرائیل کے تمام دستے مصریوں پر اچانک حملہ کرنے کے لئے اپنی پوزیشنوں میں پہنچ چکے تھے اور حملے کے حکم کے منتظر تھے۔ جب اسرائیلی فضائی بیڑے نے مصر کے ہوائی اڈوں پر حملہ کر دیا تو مصری اسی بات پر حیران ہوتے رہے کہ اسرائیلیوں نے تو حملے میں پہل نہ کرنے کا اعلان کیا تھا، پھر یہ ہوائی حملہ کیسا ہے؟ جنرل ویزمین (اسرائیلی ڈائریکٹر آف اپریشن) نے اچانک حملے کا یہ جواز پیش کیا تھا کہ مصری فوجیں ۱۹۵۶ کی نسبت زیادہ تربیت یافتہ اور تجربہ کار تھیں اور جدید اسلحہ سے لیس۔ لہٰذا حملے میں پہل کر کے اسرائیلی جنگی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اور چونکہ مصر عقبہ کی ناکہ بندی کر چکا تھا جس کا مطلب اعلانِ جنگ تھا، اس لئے اسرائیلی حکومت نے اعلانِ جنگ کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس کے علاوہ ویزمین نے اخباری نمائندوں کو یہ بھی بتایا کہ ہم بالکل نہیں چاہتے تھے کہ جنگ ہمارے ملک میں ہو۔ اس لئے ہم حملے میں پہل کر کے جنگ دشمن کے ملک میں لڑنا چاہتے تھے۔

اسرائیلیوں نے یہ عیارانہ پروپیگنڈہ کر کے کہ اسرائیل جنگ میں پہل نہیں کریگا، مصریوں کو دھوکے میں رکھا اور اچانک فضائی حملہ کر کے مصر کی ایئر فورس کو مفلوج کر دیا تاکہ صحرا کی لڑائی میں مصر کے بکتر بند دستے فضائی تحفظ سے محروم رہیں۔ چنانچہ

اسرائیلیوں نے اپنا یہ مقصد حاصل کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ای سی ایم E.C.M. کو استعمال میں لا کر نہ صرف مصریوں کے ریڈار اور وائرلیس سسٹم کو جام کیا بلکہ انہیں گمراہ کن پیغام بھی دیئے۔

یہ کہنا کہ مصری جم کر لڑ نہ سکے اور وہ اسلامی روایات کے مطابق شجاعت اور ایثار سے نہ لڑے، غلط ہے۔ دونوں طرفوں کے جرنیلوں کے بیانات سے تصدیق ہوتی ہے کہ مصری 'فضائی کور' کے بغیر اور ای سی ایم کے باوجود لڑے اور دلیری سے لڑے۔ صرف وہی لوگ مصریوں کی جنگی پوزیشن کو سمجھ سکتے تھے جو جنگ اور خصوصاً صحرا میں ٹینکوں کی جنگ کو سمجھتے ہیں۔ اوپر بیان کی ہوئی دشواریوں کے باوجود مصریوں کا ذرا سی دیر کے لئے بھی میدان میں جم جانا کارنامہ تھا۔ جنگوں کی تاریخ شاہد ہے کہ جو فوج عیاری اور فریب کاری سے اچانک حملہ کر کے ——— SURPRISE اور اقدام یعنی INITIATIVE جیسے اہم ترین جنگی فوائد حاصل کر لے، اس کے سامنے طاقتور حریف کا بھی ٹھہرنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہو جاتا ہے۔

مصریوں کو جس طرح دھوکے دیئے گئے، اس کی ایک جھلک دیکھ لیجئے۔ اسرائیلیوں کے ایک کمانڈر جنرل یافی کا بیان ہے کہ جب ہم رات کے وقت ابوانجیلا سے نخل کی طرف بڑھے تو ہم علی الصبح اچانک ایک مصری مورچے کے سامنے جا پہنچے۔ مصریوں کا یہ مورچہ اس قدر مضبوط تھا اور ایسی خوبی سے تیار کیا گیا تھا کہ وہاں کے دستوں سے ٹکر لینا ہمارے لئے خاصا دشوار ہو جاتا۔ کم از کم میرے لئے اس مورچہ کو فتح کرنا محال تھا۔ میں نے دوربین سے دیکھا کہ وہاں سٹالن ٹینک کھڑے تھے۔ روسی ٹینکوں کی یہ قسم بڑی طاقت ور ہوتی ہے۔ ان ٹینکوں کی مدد کے لئے بڑی توپیں

بھی موجود تھیں۔ ہمارے طیارے بھی اس مورچے کی صحیح خبر نہ دے سکے تھے۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ مورچہ کس قدر قابلیت سے بنایا گیا تھا۔

میں نے تمام خطروں کے باوجود حملے کا حکم دے دیا۔ پیش قدمی شروع کر دی گئی اور ہم مورچے کے قریب جا پہنچے لیکن مصریوں نے کوئی جوابی فائرنگ نہ کی۔ میں اسے دشمن کی چال سمجھتا رہا۔ پھر بھی پیش قدمی کرتا گیا، حتیٰ کہ میں نے اس مورچے کو گھیرے میں لے کر فتح کر لیا۔ مصریوں کا بریگیڈیئر احمد عبدالنبی سامنے آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آپ نے بغیر مزاحمت کے مورچہ ہمارے حوالے کیوں کر دیا ہے؟

بریگیڈیئر احمد نے جواب دیا ــــ "مجھے ہائی کمان سے حکم ملا تھا کہ خاموشی سے مورچے سے پیچھے ہٹ جاؤں۔"

"پھر آپ پیچھے کیوں نہ ہٹ گئے؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ آپ کی فورس اوپر چڑھ آئی تھی"۔ بریگیڈیئر احمد نے کہا۔ "میرے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے ٹینکوں اور توپوں کو تباہ کر دوں مگر آپ سر پر آن پہنچے۔ اس لئے میں نہ پیچھے ہٹ سکا، نہ اسلحہ تباہ کر سکا، نہ لڑ سکا۔"

یہ بیان بظاہر کسی انٹاری کمانڈر کا معلوم ہوتا ہے لیکن بات دراصل یہ نہیں۔ یہ اسرائیلیوں کے ای سی ایم کا کرشمہ تھا۔ مصری بریگیڈیئر کو اسرائیلیوں نے پیغام دیا تھا کہ خاموشی سے پیچھے ہٹ جاؤ۔

بریگیڈیئر احمد عبدالنبی کو برا بھلا کہنے سے پہلے ذرا ۱۹۴۰ میں فرانس سے برطانوی اور فرانسیسی فوجوں کی پسپائی کو یاد کر لیجئے گا۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اتحادیوں کی اس تاریخی پسپائی میں، میں بھی شریک تھا۔ لیبل کے مورچوں میں اتحادی

کمانڈروں کو یہ پیغام ملا تھا — "ہتھیار پھینک کر ڈنکرک پہنچو" — اور اتحادی جرنیلوں نے بغیر سوچے سمجھے اپنی فوجوں کو حکم دے دیا تھا کہ ہتھیار پھینکو اور جانیں بچا کر ڈنکرک پہنچو جہاں سے تمہیں بحری جہاز انگلستان لے جائیں گے — یہ پیغام جرمنوں نے ای سی ایم پر دیا تھا۔

یہاں یہ بات خاص طور پر ذہن میں رکھئے کہ میرے ساتھ چھ سو مسلمان سپاہی تھے جن میں سے کسی ایک نے بھی ہتھیار نہیں پھینکے تھے اور جب اتحادیوں کی یہ بھگدڑی ہوئی فوجیں انگلستان پہنچیں تو صرف یہ چھ سو مسلمان سپاہی تھے جن کے پاس ہتھیار تھے، باقی تمام کی تمام اتحادی فوج نہتی تھی۔

اب اتحادی فوجوں کی نفری اور جنگی قوت کا موازنہ مصر کی فوج سے کیجئے اور سوچئے کہ اگر اتحادی دھوکہ کھا گئے تو مصر کی توان کے مقابلے میں کہیں کمزور فوج تھی۔

یہاں میں اپنے موضوع سے ہٹ کر ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ قوم کے لئے گوریلا جنگ کی تربیت ازبس لازمی ہے تاکہ اگر فوج کبھی فریب خوردہ یا شکست خوردہ ہو جائے تو قوم فوج کے قدم جمانے میں مدد دے سکے۔

اسرائیلیوں کے فضائی بیڑے کے کمانڈر ایچیف ہڈنے کہا کہ ہم نے مصری ہوابازوں کو ای سی ایم پہ گمراہ کن پیغام دیئے بلکہ ان میں سے بعض کو تو ہم نے اچھے بھلے طیارے سے کود جانے کو کہا اور یہ بھی بتایا کہ یہیں کود جاؤ، نیچے آرمی کی جیپ کھڑی ہے۔ وہ اسے اپنے کمانڈر کا پیغام سمجھ کر طیاروں سے کود گئے اور نیچے جو جیپیں کھڑی تھیں وہ اسرائیلی فوج کی تھیں جن میں انہیں جنگی قیدی کی حیثیت سے بٹھا لیا گیا۔

یہاں میں مصریوں اور عربوں کو اس کوتاہی کا مجرم ضرور قرار دوں گا کہ وہ رسولِ اکرم صلعم کا یہ پیغام بھول گئے تھے ـــــ "اپنے آپ کو جانو، دشمن کو پہچانو" مصریوں اور عربوں کے درمیان رہ کر اسرائیل اپنی قوم کے ہر فرد و بشر (مرد اور عورت) کو گوریلا جنگ کی تربیت دیتا رہا مگر انہیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یہ درست ہے کہ اسرائیلی افسروں کو دوسری عالمگیر جنگ میں یورپ اور افریقہ کے محاذوں پر گوریلا اور زمین دوز لڑاکا جماعتوں میں کام کرنے کا موقعہ ملا تھا لیکن اس سے انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے حریف کو دھوکہ دینے اور عیارانہ چالوں میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ پچیس برس تک اپنی قوم کی انہی بنیادوں پر تربیت دیتے رہے حتیٰ کہ انہوں نے پوری کی پوری قوم کو فوجی بنا ڈالا۔ اُن کے بچے اسی فوجی اور جنگی فضا میں جنمے پلے اور ان کی پرورش انہی خطوط پر ہوئی۔ اسرائیلیوں کا دیوتا بن گوریئن بیاسی (۸۲) برس کا ضعیف بوڑھا ہے۔ اس کے باوجود وہ اب بھی قوم کی تربیت اور فلاح و بہبود میں جوانوں کی طرح عملی حصہ لیتا ہے۔ اسرائیلی افواج کے جرنیل، دایان، ہڈ، ٹل، یافی، شیراں، امواس اور نہال وغیرہ بن گوریئن ہی کے تربیت یافتہ ہیں۔ سب خفیہ اور دہشت پسند جماعتوں میں عملی کام کر چکے ہیں اور ان جماعتوں کے لیڈر بھی رہے ہیں۔ انہیں جنرل ونگیٹ نے خاص طور پر ٹریننگ دی تھی اور انہیں اولیور کرامویل کا یہ مقولہ ازبر کرایا تھا "پہلے یہ سمجھ لو کہ تمہاری جنگ کا مقصد کیا ہے اور تم کس کی خاطر لڑ رہے ہو۔ اس مقصد کو سمجھ کر اسے اپنا ایمان بنا لو اور اس پر ثابت قدمی سے عمل کرو"۔ جنرل ونگیٹ نے انہیں خاص طور پر ذہن نشین کرایا تھا کہ اپنے مقصد کی تکمیل کی خاطر جنگ کے قوانین، بین الاقوامی پابندیوں

اور اخلاقی نظریات کو بالکل فراموش کر دو۔ اپنے مقصد میں جس طریقے سے بھی کامیابی حاصل کر سکتے ہو وہ جائز ہے اور اس بات کو بھی دل سے نکال دو کہ دنیا کیا کہے گی۔

اس اصول کے تحت اسرائیلیوں نے اپنی افواج اور اپنے عوام کو تربیت دی۔ چنانچہ انہوں نے بے ضرر اور نہتے شہریوں پر جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، نیپام بم گرائے اور انہیں مشین گنوں کا نشانہ بنایا۔ انہیں ایسا تو کوئی خدشہ ہی نہ تھا کہ دنیا کیا کہے گی۔ دنیا انہیں کچھ کہنے بھی کیوں لگی تھی۔ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے مغربی ممالک کے اخبار اور ریڈیو موجود تھے جن پر صیہونیوں کا ہی قبضہ تھا۔ ان اخبارات اور ریڈیو نے یہ پروپیگنڈا تو نشر کر دیا کہ مصر نے گیس بم گرائے ہیں لیکن اسرائیلیوں نے جو نیپام بم گرائے تھے، ان پر انہوں نے پردہ ڈالے رکھا۔

اینگلو امریکی نامہ نگار —

ڈنکرک، برما اور کوریا کو بھول گئے

اس قسم کی جنگ پہلی بار نہیں لڑی گئی جس میں کسی فوج نے مزاحمت کے بغیر ہتھیار ڈال دیئے ہوں۔ امریکہ اور برطانیہ کے اخباروں اور رسالوں نے لکھا ہے کہ مصری فوج کے پندرہ ہزار افسر اور سپاہی بوٹ اتار کر بھاگے اور ایک بھی گولی فائر

کئے بغیر ٹینک دشمن کے حوالے کر دیئے۔ لیکن اینگلو امریکی بلاک کے جنگی وقائع نگار، اسرائیل کے جنرل شیران کا یہ بیان نظر انداز کر گئے جس میں اس نے اعتراف کیا کہ "جب ہم تمل پر قابض ہو گئے تو مجھے پیش قدمی کا حکم ملا کیونکہ مصر کا ٹینک بریگیڈ ہمارا گھیرا توڑ کر نہر سویز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے روکنا لازمی تھا۔ میں نے مصریوں کے اس ٹینک بریگیڈ کو اپنے ڈویژن سے عقب اور دو نو فلنکوں (پہلوؤں) سے گھیرے میں لے لیا۔ یہ مقابلہ ایک مصری بریگیڈ اور ایک اسرائیلی ڈویژن کا تھا۔ مصری عزم اور ثابت قدمی سے لڑے۔ یہ میدان خونریزی کے لحاظ سے "وادی مرگ" بن گیا تھا۔ دونوں طرف ہزارہا سپاہی اور افسر مارے گئے۔ دونوں طرف ٹینک جل رہے تھے۔ ریت کے طوفان نے بارود اور جلتے ٹینکوں کے دھوئیں کے ساتھ مل کر سب کو اندھا کر دیا۔ ہر سُو لاشیں نظر آتی تھیں اور زخمی تڑپ رہے تھے۔ دونو فریق زندگی کا آخری معرکہ لڑ رہے تھے۔ اتنے میں اسرائیلی ایئر فورس آ گئی جس نے مصری بریگیڈ پر بم، راکٹ اور نیپام گرانے شروع کر دیئے۔ ہمیں ایئر فورس کی مدد ملی تو مصریوں کے پاؤں اُکھڑ گئے مگر وہ ہمارے گھیرے میں تھے۔ اوپر سے ہمارے ہوا بازوں نے اُن پر قیامت بپا کر رکھی تھی۔ آخر میدان ہمارے ہاتھ رہا۔ اس کے بعد ہم نے ٹیلا درّے پر قبضہ کر کے مصر کی فوج کو دو حصوں میں کاٹ دیا۔"

جنرل شیران کے اس بیان سے صاف نظر ہوتا ہے کہ مصری جم کر لڑے اور فضائی مدد کے بغیر لڑے۔

اب میں اینگلو امریکی بلاک کے اخباروں کی طرف لوٹتا ہوں جنہوں نے سطحی پروپیگنڈا کر کے عربوں کو ذلیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری عمر جنگ و جدل میں

گذر گئی ہے۔ میں ایسی کئی پسپائیوں کا عینی شاہد ہوں جہاں سپاہی تو سپاہی، بڑے بڑے افسر بھی بوٹ اتار کر بھاگے تھے۔ میں آپ کو تاریخ کے دور دراز اندھیرے گوشوں میں نہیں لے جاؤں گا۔ اسی صدی کی پسپائیاں سن لیجئے۔

دوسری عالمگیر جنگ میں جرمنوں نے فرانسیسی اور برطانوی لشکر کو ایسا بھگایا تھا کہ ان اتحادیوں کی تاریخ میں ڈنکرک کلنک کا ٹیکہ بن گیا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر آیا ہوں، میں بھی اس پسپائی میں شامل تھا۔ میرے ساتھ چھ سو مسلمان سپاہی اپنے ہتھیاروں سے دستبردار نہیں ہوئے تھے۔ اس کے برعکس نپولین اور رچرڈ سوئم جیسے جنگجوؤں کی اولادیں کی تعداد دو لاکھ تھی، ننگے سر اور ننگے پاؤں بھاگی تھی۔ ڈری ہوئی بھیڑوں بکریوں کے اس ہجوم میں ولندیزی اور بلجی فوجیں بھی تھیں۔ کیا عربوں کا مذاق اڑانے والے اینگلو امریکی نامہ نگار برما کی پسپائی بھول گئے ہیں؟ کیا پرل ہاربر پر انہیں جاپان کی یلغار اور امریکیوں کی بھگدڑ یاد نہیں رہی؟ بحرالکاہل کے جزیروں، سنگاپور اور ملایا سے جب انگریز ہتھیار پھینک کر بھاگے تھے، وہ بھی انہیں یاد نہیں؟

زیادہ دُور نہ جائیے۔ یہ کل کی بات ہے جب بھارت کے وہ مونٹینئن اور انفنٹری ڈویژن جنہیں امریکہ نے چین کے خلاف لڑانے کے لئے مسلح کیا اور انہیں خصوصی جنگی ٹریننگ دی تھی، پہلے نیفا سے چینیوں کے آگے پھر چھمب، جوڑیاں، کھیم کرن اور راجستھان سیکٹر میں پاک فوج کے آگے ہتھیار، توپیں، ٹینک اور حد یہ کہ جنگی سکیمیں اور نقشے تک پھینک کر بھاگے تھے ـــــ کیا رن کچھ میں امریکیوں اور انگریزوں نے بھارتی سپاہیوں کے بوٹ اور تیلونیں جگہ جگہ بکھری ہوئی نہیں دیکھی تھیں؟

ویت نام میں امریکیوں کا کیا حشر ہو رہا ہے ؟

جنگِ ستاریہ میں کمال اتاترک کی نفری بھی کم تھی اور ہتھیار بھی تھوڑے تھے۔ ان کا مقابلہ انگریزوں اور یونانیوں سے تھا جو ترکوں سے کئی گنا زیادہ اور مکمل طور پر مسلح تھے۔ ترکوں نے ہلہ بولا تو انگریز اور یونانی بوٹ اتار کر بھاگے تھے۔

۱۹۴۹ میں چین میں چیانگ کائی شیک اور امریکہ کی فوجیں اشتراکی ..... فوج سے شکست کھا کر ہتھیار اور بوٹ پھینک کر بھاگی تھیں۔ میں وہ امریکی ہتھیار اور دیگر اسلحہ چین کے عجائب خانوں میں دیکھ آیا ہوں۔

پسپائیوں اور شکستوں کی یہ فہرست بہت طویل ہے۔ میں تاریخ کے حقائق اور اپنے تجربے کی بناء پر وثوق سے کہتا ہوں کہ اگر عرب آج مات کھا گئے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہوئی نہ ہمیں مایوس ہونا چاہیے۔ عرب ختم نہیں ہوتے۔ وہ دھوکے میں آکر ایک ضرب کھا کے سنبھل رہے ہیں۔ وہ انشاء اللہ اٹھیں گے۔ اگر ۱۹۴۱ میں اتحادیوں کی بھگوڑی فوج پھر سے مسلح اور منظم ہو کر فاتح بن سکتی ہے تو عرب بھی اس کے اہل ہو سکتے ہیں۔

میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ عرب صرف اسلحہ بارود کے بل بوتے پر جنگ نہیں جیت سکتے۔ انہیں اپنے اندر روحانی قوت بیدار کرنی ہوگی اور اپنے نفاق کو اتحاد میں بدلنا ہوگا۔ فرانس سے اتحادیوں کی پسپائی کے متعلق انگلستان میں باقاعدہ تفتیش ہوتی تھی۔ مجھے بھی اس تفتیش میں شامل کیا گیا تھا۔ تمام احوال و کوائف کا جائزہ لے کر فیصلہ یہ کیا گیا تھا کہ فوجوں میں لڑنے کا عزم اور روحانی قوت بیدار کی جائے۔ صرف اسلحہ بارود اور فوجی ٹریننگ کام نہیں دے سکتی۔ اس کے مطابق اتحادی فوجوں کی تنظیمِ نو کر کے انہیں نئے انداز سے تربیت دی گئی تھی۔

جنگ ستمبر میں پاک فوج نے جس طرح بھارت کی حملہ آور فوج کو ناک چنے چبوائے ہیں وہ محض روحانی قوت کا کرشمہ ہے۔ مسلمان سپاہی کو، خواہ وہ عربی ہے یا ایرانی، ترک ہے یا پاکستانی، کسی پیچیدہ تربیت کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں چودہ سو سال پہلے راستہ دکھا چکے ہیں۔ آپؐ کے یہ اصول ہمارے دین کا لازمی جزو ہیں۔ عربوں سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے ہتھیاروں پر بھروسہ کیا اور رسول اللہ صلعم کے اس فرمان کو بھول گئے ـــــ اپنے آپ کو جانو اور دشمن کو پہچانو ـــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی دفاعی تیاریوں میں کوتاہی نہ کرو، جنگی تیاریوں میں سستی نہ کرو اور دشمن پر بھروسہ نہ کرو۔

عربوں کی دشواریاں

ـــــ اور کوتاہیاں

میں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اسرائیلیوں نے اپنی سولہ سالہ بلکہ پچاس سالہ جنگی تیاریوں کو چھپائے رکھا اور عربوں کے خلاف واویلا مچاتے رہے کہ وہ جنگ پسندی کے مظاہرے کر رہے ہیں۔ اس بے بنیاد اور شر آلود پروپیگنڈے کو نشر کرنے میں جہاں برطانوی امریکی بلاک نے اسرائیلیوں کی خوب مدد کی وہاں عرب قائدین کی لاف زنی اور غیر محتاط بیانات نے صورتِ حال بہت خراب کی۔ اس کے علاوہ

اسرائیل کی فریب کاری نے بھی عربوں کو نقصان پہنچایا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میدانِ جنگ میں مصریوں اور عربوں سے جو جنگی نوعیت کی کوتاہیاں ہوئیں انہیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ عربوں کو اب اپنی ان لغزشوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ان کی بنیادی کوتاہی تو یہ تھی کہ اسرائیل نے سی آئی اے کی مدد سے تمام عرب ممالک اور خصوصاً مصر میں جاسوسوں کا جال بچھائے رکھا مگر عرب اسرائیل کے متعلق اتنا بھی نہ جان سکے کہ ان کی جنگی قوت کیا ہے، ان کی نقل و حرکت کیسے ہوتی ہے اور ان کے عزائم کیا ہیں۔

عرب اتحادیوں کی ایک اور بڑی دشواری یہ تھی کہ بعض ممالک مثلاً الجزائر اور عراق اپنی فوجوں کو موبلائز MOBILIZE ہی نہ کر سکے یعنی فوجوں کو میدانِ جنگ تک ہی پہنچا سکے اور جنگ ختم ہو گئی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے کبھی بھی اس حقیقت کو محسوس نہ کیا کہ دورِ جدید کی جنگ میں پیدل چلنے والے یا شتر سوار سپاہیوں کا وجود ختم ہو چکا ہے اور جس کسی نے اس قسم کی پیادہ فوج پر بھروسہ کیا وہ اپنی شکست کو دعوت دے گا۔

فوجوں کو میدانِ جنگ تک پہنچا دینا بجائے خود ایک کام ہے لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اہم ترین اقدام تمام فوجوں کو ایک ہائی کمان کے پلان کے تحت مختلف مقامات پر ڈیپلائے کرنا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی رسد و رسائل جسے LOGISTICS کہتے ہیں، کا ہونا از بس ضروری ہوتا ہے، ورنہ فوجیں راشن، پانی، ایمونیشن، کمک اور طبی امداد سے محروم رہتی ہیں۔ ان تمام ضروریات کے پیشِ نظر دیکھا جائے تو بیشتر عرب اتحادیوں کی فوجیں لڑنے

کے قابل ہی نہیں تھیں۔ اس صورتِ حال میں جذبہ اور عزم بھی کام نہیں آتا۔

جنگ سے پہلے فوج کے کمانڈروں کے لئے انتہائی ضروری ہوتا ہے کہ وہ میدانِ جنگ کے ایک ایک انچ سے واقف ہوں۔ یہ واقفیت نقشوں، طیاروں اور جاسوسوں کی مدد سے بہم پہنچائی جاتی ہے۔ اسے انٹیلی جنس کہتے ہیں جس کے ماہرین کوائف اور قرائن کا بنظرِ غائر جائزہ لے کر دشمن کے ارادوں اور جنگی چالوں کے متعلق بھی پیش گوئیاں کر دیا کرتے ہیں اور تجربہ کار کمانڈر زمین کے مختلف خدوخال کو دیکھ کر اندازہ کر لیا کرتے ہیں کہ دشمن اس قسم کے خطے میں کس قسم کی فوج لائے گا اور کیا چال چلے گا چنانچہ وہ اپنے پلان میں دشمن کی ان چالوں کے تدارک کی گنجائش رکھتا ہے۔

لیکن عرب کمانڈر اسی ایک بنیادی حقیقت کا تعین نہ کر سکے کہ لڑائی کن مقامات پر متوقع ہے یا دشمن کو کس جگہ لڑنے پر مجبور کیا جائے یعنی ایسے مقامات اور خطے جہاں دشمن کو الجھا کر اپنے نازک مقامات سے اُس کی توجہ ہٹائی جا سکے۔ مثلاً جنگِ ستمبر میں پاک فوج کا کھیم کرن اور اس سے دس بارہ میل آگے تک کے علاقے پر قبضہ کر لینا پاکستانی ہائی کمانڈ کی کلاسیکی چال تھی۔ لاہور پر دشمن کے بے پناہ دباؤ کو کم کرنے کے لئے پاک فوج نے قصور کھیم کرن محور میں برق رفتار حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اس وقت کیا گیا جب بھارت کا نمبر ۲ انڈی پنڈنٹ آرمرڈ (بکتر بند) بریگیڈ گروپ بھارتی قصبے بھیکی ونڈ میں قصور پر حملہ کرنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ اس بھارتی بریگیڈ کی نفری اور بکتر بند قوت ڈویژن جتنی ہی تھی۔ یہ جارحانہ حملے کے لئے تیار تھا لیکن پاک فوج کے صرف ایک انفنٹری بریگیڈ نے چند ایک ٹینکوں کی

مدد سے اسے دفاع میں لڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس چال کا یہ فائدہ ہوا کہ دشمن کا ایک طاقتور بریگیڈ گروپ اوراس کے ساتھ دو انفنٹری اور ماؤنٹین ڈویژن پاک فوج کے بریگیڈ سے الجھ گئے۔

پاکستان نے دوسری چال یہ چلی کہ چولستان میں ڈیزرٹ (صحرائی) فوج کو آگے بڑھادیا جس نے جان کی بازی لگا کر مونا باؤ، کشن گڑھ، گھٹاروساودھے والی اور بونگانے والا جیسے قلعوں اور چوکیوں پر قبضہ کر کے دشمن کے دو ہزار مربع میل پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح دشمن کے دو اور ڈویژن پاکستان کو فتح کرنے کی سکیم سے ہٹ گئے۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ ساودھے والا کے میل ہا میل وسیع علاقے کا کوئی نقشہ پاکستانی ڈیزرٹ فورس کے پاس نہیں تھا، نہ اس چھوٹی سی فورس کے پاس اس علاقے کی کوئی انٹیلی جنس رپورٹ تھی۔ حملے سے ذرا پہلے پاک فوج کے ایک میجر نے آرمی کے چھوٹے سے مشاہداتی طیارے ایل۔۱۹ میں پرواز کر کے تمام علاقے کا نقشہ اور خدوخال پنسل سے کاغذ پر بنا لئے تھے۔ پرواز کے دوران دشمن کی مشین گنیں اس پر مسلسل فائر کرتی رہی تھیں۔ حد یہ کہ طیارے کا ہوا باز (جو توپخانے کا کپتان تھا) طیارے کو دشمن کی پوزیشنوں کے پیچھے بہت نیچی پرواز کر کے لے گیا تھا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز سے تمام علاقے سے واقفیت حاصل کر لی گئی اور ڈیزرٹ فورس کا حملہ کامیاب رہا۔ چنانچہ کھیم کرن اور راجستھان کی فتوحات نے لاہور اور سیالکوٹ پر دشمن کا دباؤ کم کر دیا اور دشمن پاکستان کو فتح کرنے کے ارادے سے دستبردار ہو کر محض خفت مٹانے کی خاطر لڑتا رہا۔

اس کے برعکس مصری فوج کے کمانڈر صرف یہ دیکھتے رہے کہ کون سا علاقہ دشوار گذار ہے۔ پھر ایسے علاقوں کو اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق دشمن کے لئے دشوار گذار قرار دے کر مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی کہ ہو سکتا ہے دشمن انہیں اسی مشکل علاقے میں لڑنے پر مجبور کر کے انہیں کچل دے۔ انہیں یہ بھی علم نہ تھا کہ اسرائیلی ان کے تمام علاقوں کے چپے چپے کو اپنے جاسوسوں کی نظر سے دیکھ چکے ہیں۔ جاسوس ہی نہیں اسرائیلی جرنیلوں کے کہنے کے مطابق دایان اور ویزمین جنگ سے پہلے ان علاقوں میں چوری چھپے گھوم پھر آئے تھے لیکن ہمارے مسلمان بھائیوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

ٹینکوں کی جنگ —

صحرائے سیناتی اور سیالکوٹ

ٹینکوں کی لڑائی میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ ٹینک یونٹوں کو بکھرنے نہ دیا جائے اور ٹینکوں کو متحرک MOBILE رکھا جائے۔ ٹینک حملے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ٹینکوں کے AGGRESSION ساتھ انفنٹری ہوتی ہے۔ ٹینکوں کی مثال گھونسے کی ہے۔ کامیاب گھونسا وہی ہوتا ہے جو پانچوں انگلیوں کو بند کر کے مارا جائے۔ انگلیاں پھیلا کر گھونسہ نہیں

مارا جاسکتا۔ اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ اپنی انگلیاں ٹوٹنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ گھونسہ جب تک متحرک بھی نہ ہو حریف کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ گویا گھونسہ دائیں بائیں گھومتا رہنا چاہئے مگر مصریوں نے گھونسے کو ایک مقام پر ساکن رکھا اور اس انتظار میں رہے کہ دشمن خود ہی گھونسے کی زد میں آجائے یا گھونسے کی سیدھ میں آئے تو ماریں۔

عرب ہائی کمان نے اپنے ٹینکوں کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم کر کے انہیں دفاعی مورچوں میں قید کر دیا۔ یعنی جارحانہ ہتھیار کو دفاع میں پابند کر دیا۔ ان کی حفاظت کے لئے عقب میں اور فیلڈ میں توپخانہ اور انفنٹری بھی لگا دی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس دفاعی سکیم کے مطابق توپخانے اور انفنٹری کو بھی غیر متحرک اور ٹینکوں کا پابند رہنا تھا۔

اسرائیلی کمانڈر جنرل ٹل نے کہا تھا ــــ "مصریوں نے ٹینکوں کے مورچے ایسی عمدگی سے تیار کئے تھے کہ دور سے ان کی موجودگی کا علم ہی نہ ہوتا تھا"۔ ہوسکتا ہے کہ جنرل ٹل نے مصریوں کی تعریف کی ہو لیکن ان کے مورچوں کی "عمدگی" میں مصریوں کی نالائقی نمایاں ہے۔ انہوں نے ٹینکوں کو مورچوں میں رکھ کر ان کے اصلی رول کو ختم کر دیا تھا۔ ٹینک تو گھوم پھر کر لڑنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مورچہ بندی کرنا تو انفنٹری کا کام تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مصریوں نے ایک مقام پر بیٹھ کر گھونسہ تانے رکھا، اس امید میں کہ دشمن خود ہی زد میں آجائے گا۔ جہاں انہوں نے گھونسہ مارا وہاں انہوں نے انگلیاں پھیلا لیں یعنی ٹینکوں کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم کر کے بکھیر دیا۔ ایسا کر کے مصری دشمن کا نہیں اپنی تباہی کا انتظام

کر رہے تھے۔

میں نے مصریوں اور دیگر عربوں کے جنگی پلان کا جو مطالعہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہر مورچے کا کمانڈر خود مختار تھا اور کمانڈروں کا باہمی رابطہ ناپید تھا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ ساکن رہے اور غیر متحرک دفاعی جنگ لڑتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسرائیلی آرمرڈ کور نے یکے بعد دیگرے تمام مورچوں کو گھیرے میں لے کر تباہ کر دیا۔

ٹینک کے صحیح استعمال کو واضح کرنے کے لئے میں ستمبر ۱۹۶۵ میں سیالکوٹ سیکٹر کی ٹینکوں کی جنگ کا ذکر کروں گا۔ بھارت زیادہ سے زیادہ بکتر بند قوت لایا تھا جسے تین سو چھوٹی بڑی توپوں اور بے شمار لڑاکا طیاروں کا آتشیں چھاتہ حاصل تھا۔ دشمن کی زیادہ سے زیادہ قوت کے مقابلے میں پاک فوج کے پاس اس سیکٹر میں لڑنے کے لئے کم سے کم بکتر بند قوت تھی۔ پاکستانی کیولری نے اپنے ٹینکوں کو کہیں بھی ساکن نہ رہنے دیا اور اس قدر تیز رفتار متحرک جنگ لڑی کہ دشمن کی ٹینک یونٹوں کو کھجر جانے پر مجبور کر دیا۔ ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جہاں ہمارے ایک ایک ٹینک نے بارہ سے اٹھارہ ٹینکوں تک کا مقابلہ کیا — ایک جگہ ساکن ہو کر نہیں گھوم پھر کر۔ دشمن کی تباہی اور حملے کی ناکامی پاکستانیوں کے اسی کمال کا کرشمہ ہے۔

اس مقام پر مجھے صلیبیوں کے فرینکس کی قلعہ بندیاں یاد آتی ہیں جو انہوں نے شام کے علاقے میں قائم کی تھیں۔ ہر قلعے کا حاکم نائٹ، ڈیوک یا بیرن تھا۔ وہ ایک دوسرے سے حسد بھی کرتے تھے۔ صلاح الدین ایوبی نے حنین کے مقام پر معرکہ لڑ

کر فرنگیس کے بادشاہ کو گرفتار کر لیا تو قلعوں کے حاکم خود مختار بن کر مرکز سے لاتعلق ہو گئے، حالانکہ ان کا مدِ مقابل ایک یعنی صلاح الدین ایوبی تھا۔ سلطان ایوبی نے صلیبیوں کی اس خامی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برق رفتاری سے حملے کئے اور یکے بعد دیگرے تمام قلعوں کو سر کر کے شام کو صلیبیوں سے آزاد کرا لیا۔

یہ تو مسلمانوں کی تاریخ تھی جس سے مسلمانوں کو فائدہ اٹھانا چاہئے تھا مگر ہوا یہ کہ اسلامی فنِ حرب کو اسرائیلیوں نے اپنا کر مسلمانوں کو شکست دے دی۔

اسرائیلی جنرل ٹل نے اپنی آرمرڈ کور کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا اور سب کو اپنی مرکزیت کے تحت رکھا۔ جب یہ تین بکتر بند حصے مصریوں کے مورچوں کو تباہ کر رہے تھے تو مصری ٹینکوں کی کوئی مورچہ بند ٹولی کسی دوسری ٹولی کی مدد نہ کر سکی۔ بے شک اسرائیلیوں نے مصریوں کو دھوکے میں رکھ کر حملے میں پہل کی تھی اور ان کے فضائی بیڑے کو تباہ کر دیا تھا۔ اور ای سی ایم کے استعمال سے انہیں گمراہ بھی کیا تھا لیکن مصر کے بری مورچوں میں ملاپ ہوتا اور وہ ٹینکوں کو متحرک رکھتے تو وہ فضائی کور کے بغیر بھی زیادہ دیر تک لڑ سکتے تھے یا کم از کم اس بری طرح اور اتنی جلدی تباہ نہ ہوتے۔ جہاں تک انفرادی جنگ کا تعلق ہے، یہ تو اسرائیلی جرنیلوں نے اعتراف کیا ہے کہ مصری اپنے اپنے مورچوں میں خوب لڑے — کاش ان میں مرکزیت بھی ہوتی۔

اسرائیلی جرنیلوں اور جنگی مبصروں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرب ہائی کمانڈ اور کمانڈروں کے درمیان وائرلیس پر کوڈ CODE (خفیہ الفاظ) استعمال نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ عام زبان میں جنگی پیغامات کا تبادلہ کرتے رہے

اس بھیانک لغزش نے اسرائیلیوں کے لئے ای سی ایم کا استعمال اور زیادہ آسان کر دیا۔

دیگر عرب اتحادی اپنے اپنے طور پر بظاہر ایک ہائی کمانڈ کے تحت دفاع میں مورچہ بند رہے لیکن ان میں جنگی یک جہتی نہیں تھی۔ جب اسرائیل نے سینائی میں مصری فوجوں پر حملہ کیا تھا اس وقت اردن اور شام کی فوجوں کو مورچہ بند نہیں رہنا چاہئے تھا بلکہ اسرائیل پر حملہ کر دینا چاہئے تھا۔ ان تینوں ملکوں کی فوجیں مجہول دفاع PASSIVE DEFENCE کے اصول پر دشمن کے حملے کی منتظر رہیں اور جب حملہ ہوا تو تابڑ توڑ ضربیں سہتی رہیں۔

میں نے دو عالمگیر جنگوں میں دنیا کی طاقت ور ترین فوجوں کو لڑتے دیکھا ہے۔ میں ایک فریق کے ساتھ سپاہی کی حیثیت سے لے کر اعلیٰ افسر کی حیثیت تک لڑا ہوں۔ میرا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ کوئی فوج، وہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو صرف دفاعی اصول پر لڑ کر فتح مند نہیں ہو سکتی۔ جو فوج ہمیشہ دفاع میں مورچہ بند رہتی ہے وہ حملہ آور دشمن کو ستانے اور اس کی فوجوں کو از سر نو منظم ہونے کا موقع فراہم کرتی رہتی ہے۔

یہاں میں پھر جنگ ستمبر کا ذکر کروں گا۔ انڈین آرمی نے لاہور پر واہگہ، بھینی اور بھسین سے سہ طرفی حملہ کیا۔ حملہ ایک ڈویژن (نمبر ۱۵، انفنٹری ڈویژن) سے کیا گیا۔ اس کی کمک کے لئے ایک اور ڈویژن (نمبر ۲۳ مونٹین ڈویژن) تھا۔ پھر نمبر ۵۰ پیرا بریگیڈ کو بھی (آگرے یا دتی) سے بلایا گیا تھا۔ چھ ستمبر کی شام اور سات ستمبر کی صبح تک پاک فوج کے مختصر سے انفنٹری دستوں اور ایک ٹینک رجمنٹ

(ایک سکواڈرن کم) نے لاہور کا دفاع اس جانبازی سے کیا کہ پندرھویں انڈین انفنٹری ڈویژن کا نہ صرف دم خم ٹوٹ گیا بلکہ اس کا بے اندازہ جانی نقصان ہوا۔ دشمن کے جو وائرلیس پیغامات پاک فوج نے سُنے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ دشمن اس قدر نفری مروا چکا ہے کہ وہ ری گروپنگ یعنی تنظیم نو کر رہا ہے۔ جنرل سرفراز خان کے پاس اتنی قوت نہیں تھی کہ وہ جوابی حملہ کرتا لیکن اس نے اس خیال کے پیشِ نظر خطرناک حد تک کم قوت سے حملہ دشمن پر جوابی حملہ کرا دیا کہ دشمن کو ری گروپنگ کا موقعہ نہ ملے۔ چنانچہ دشمن کے سنبھلنے سے پہلے ہی صرف دو ٹینک سکواڈرن اور چند ایک انفنٹری کمپنیوں نے اس قدر تیز جوابی حملہ کیا کہ دشمن سکواڈرنوں کو ٹینک رجمنٹیں سمجھ کر پیچھے ہٹنے لگا۔ ادھر توپ خانے نے کمال کر دکھایا اور دشمن کے لئے پسپائی بھی محال کر دی۔ لاہور کے دفاعی دستے سرحدوں سے میلوں آگے نکل گئے اور بھارت نے امرتسر کا شہر خالی کرانا شروع کر دیا۔

یہ تو بھارت کی خوش قسمتی تھی کہ پاکستان ان کی طرح ملک گیری کی خاطر نہیں لڑ رہا تھا، اس لئے اس نے اپنے دستوں کو اپنی سرحدوں میں بُلا لیا۔ لیکن دفاع سے نکل کر اس جوابی حملے کا یہ فائدہ ہوا کہ دشمن جو چھ ستمبر کو صبح نو بجے لاہور پر قابض ہونے کے لئے حملہ آور ہوا تھا، ۲۳ ستمبر تک اپنے ملک کے دفاع میں لڑتا رہا۔

عربوں کو اسلامی فنِ حرب کے مطابق دفاعی مورچوں سے نکلنا چاہئے تھا۔

رسولؐ کا پیغام

یہود کے کام آیا

اب عربوں کو دنیا کے اس شور و شغب سے کہ "عرب شکست کھا گئے" متاثر نہیں ہونا چاہئے۔ انہیں اسلامی طریقِ جنگ کو اپنانا چاہئے۔ رسول اکرم صلعم یہ طریقے وضع کر کے انہیں کامیابی سے آزما کر دکھا گئے ہیں۔ صلیبیوں کی شکستیں انہی طریقوں کا کرشمہ ہیں۔ مجاہد کے ساتھ مجاہدہ کا وجود از بس ضروری ہے۔ جس قوم نے مجاہدہ کو حرم، تجبہ خانے، ڈرائینگ روم یا باورچی خانے کی زینت بنا لیا اس قوم کی نصف جنگی قوت مفلوج ہو کر رہ گئی۔ یہ تو عربوں کا فلسفۂ جہاد ہے جسے اسرائیلیوں نے اپنا کر عربوں کو شکست دے دی۔ اسرائیل کی ہر جوان عورت فنِ حرب اور گوریلا جنگ کی تربیت یافتہ ہوتی ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اسرائیلیوں کی جنگی تیاریاں ایک رات یا چند دنوں میں مکمل نہیں ہوئیں بلکہ اسرائیلی نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے جنگی تیاریوں میں مصروف تھے۔ انہیں ہم عیار اور مکار کہہ سکتے ہیں لیکن جو قوم زندہ رہنا چاہتی ہے وہ کسی بھی لمحہ اپنی آنے والی نسلوں کی آزادی اور وقار کو فراموش نہیں کرتی۔ اس لحاظ سے اسرائیلی قابلِ تعریف ہیں۔ اس صدی کے اوائل میں اسرائیلیوں کے قائد،

بن گورئین نے (جس کا تفصیلی ذکر آگے چل کر کروں گا) فلسطین میں ایک زمین دوز جماعت بنائی جس کا نام ہگانا تھا۔ اس جماعت کا مقصد یہ تھا کہ فلسطین میں آنے والے یہودیوں کے جان و مال اور دیگر حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ اس کی تنظیم حسن بن صباح کی دہشت پسند تحریک سے مشابہ تھی۔ یعنی جہاں سے خطرے کی بُو آئے وہاں تباہی مچادو اور جس انسان سے خطرہ محسوس ہو اسے قتل کردو۔

اس زمین دوز دہشت پسند جماعت میں بن گورئین صرف ان یہودیوں کو شامل کرتا تھا جو عقیدے کے اندھے ہوں۔ ان میں صیہونیت کا جذبہ پاگل پن کی حد تک ہو اور لیڈروں کے احکام کے اس حد تک پابند ہوں کہ ان کی تعمیل کے لئے جان تک کی بازی لگا دیں۔

تھوڑے ہی عرصے میں یہودیوں کی اکثریت اس جماعت میں شامل ہوگئی۔ انہوں نے بن گورئین کو اپنا روحانی لیڈر تسلیم کر لیا۔ اس لیڈر نے ہر یہودی نوجوان مرد اور لڑکی کے لئے فوجی تربیت اور تعلیم لازمی قرار دے دی۔ ان کے لئے یہودی زبان یعنی عبرانی کو قومی زبان بنا دیا اور سب کو حکم دیا کہ وہ اس زبان میں مہارت حاصل کریں تاکہ آپس کی باتیں اور جماعت کے احکام عربوں سے پوشیدہ رکھے جائیں۔ جس یہودی میں مندرجہ بالا اہلیت نہیں ہوتی تھی، اُسے صیہونیت میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔

بن گورئین نے اپنے جنگی منصوبوں کو شاہ سلیمانؑ کے تین ہزار برس پرانے اصولوں پر تیار کیا تھا۔ شاہ سلیمانؑ کے قلعہ میگیدو میں پانچ ہزار گھوڑے اور اس زمانے کی جنگی گاڑیاں رکھنے کے علاوہ خوراک اور دیگر جنگی ضروریات کا بے اندازہ

ذخیرہ رکھا جاتا تھا۔ جب بھی جنگ ہوتی تھی، گرد و پیش کے کسانوں کو محاذوں تک جنگی سامان پہنچانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسی طرح کے چند اور جنگی اصول تھے جو دراصل مسلمانوں کی اختراع تھے مگر انہیں بن گورین نے اپنی قوم کے فوجی استحکام کے لئے اپنا لیا۔

اسرائیلیوں کی باقاعدہ یا حاضر فوج صرف چار بریگیڈ ہے۔ ہر بریگیڈ کی نفری چار ہزار ہے۔ ان میں ایک بریگیڈ چھاتہ بردار (پیراٹروپر) ہے۔ ایک ڈویژن بکتر بند ہے۔ یہ تمام فوج میکانائزڈ ہے۔ اس کے علاوہ اسرائیلیوں کی ریزرو فوج کی تعداد تیس (۳۰) بریگیڈ ہے جس کا تیسرا حصہ بکتر بند یعنی ٹینکوں اور آرمرڈ کاروں کا ہے۔ کل نفری تین لاکھ ہے جس میں انتظامیہ بھی شامل ہے۔

یہ ساری فوج ایسی خوبی سے منظم کی گئی ہے کہ جوں ہی جنگ شروع ہو، باقاعدہ یا حاضر فوج اور ریزرو فوج جس کے افسر اور سپاہی خواہ کسی بھی جگہ ملازمت یا کاروبار کر رہے ہوں چند لمحوں میں محاذ پر پہنچ جاتی ہے۔ اسرائیلی اس قسم کی مشقیں ۱۹۴۷ سے جون ۱۹۶۷ تک کئی بار کر چکے ہیں۔

یہ وہی طریقے ہیں جنہیں اسلامی دفاعی فلسفہ کہا جاتا ہے۔ اسی کو رسول اکرم صلعم نے جہاد کہا تھا اور مسلمانوں پر فرض قرار دیا تھا۔ مسلمان تو اسے بھول گئے مگر بن گورین نے اسے اپنی قوم کی بقا کے لئے اپنا لیا۔ اس فلسفۂ دفاع کے تحت ہر اسرائیلی کے لئے ساڑھے سترہ سے ساڑھے اٹھارہ برس کی عمر کے درمیان فوجی تربیت لازمی ہے۔ عورتوں کو بیس سے چوبیس (۲۴) ماہ تک اور مردوں کو چھبیس (۲۶) سے تیس (۳۰) ماہ تک باقاعدہ فوجی ملازمت بھی کرنی

پڑتی ہے۔ اس دوران انہیں پانچ اسرائیلی پونڈ ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔

اس باقاعدہ فوجی ملازمت کے عرصے میں ہر فرد کو مکمل جنگی ٹریننگ دے کر اُسے فرنٹ لائن ریزرڈ میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ انتالیس (۳۹) برس کی عمر تک اُسے فرنٹ لائن ریزرڈ میں رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد پچاس برس کی عمر تک اُسے ہوم گارڈ اور سول ڈیفنس (شہری دفاع) کی کسی یونٹ میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

ریزرو فوج کی ہر عورت اور مرد کو سال میں ایک مہینہ باقاعدہ حاضر فوج میں بُلا کر ٹریننگ دی جاتی ہے تاکہ اس کی تربیت تر و تازہ ہوتی رہے اور اُسے جنگ کے بدلتے ہوئے طور طریقوں اور احوال و کوائف سے باخبر رکھا جائے اس کے علاوہ انہیں ہر مہینے میں ایک دن ہتھیاروں کے استعمال، صفائی اور اصلی فائرنگ کی مشق کرائی جاتی ہے۔ عہدیداروں کو ذرا زیادہ عرصے کے لئے اور افسروں کو اس سے بھی زیادہ عرصے یعنی مہینے میں بارہ (۱۲) روز ٹریننگ دی جاتی ہے۔

ریزرو فوج کے لئے اسلحہ بارود، وردی اور دیگر ذاتی جنگی ساز و سامان، ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، ان کا سامان وغیرہ الگ الگ سٹوروں میں رکھا ہوتا ہے۔ ریزرو فوج کو پوری طرح علم ہوتا ہے کہ ان کا سامان کس جگہ محفوظ ہے۔ بوقتِ ضرورت وہ اس جگہ پہنچ جاتے ہیں اور بغیر تلاش اور تردد کے انہیں مطلوبہ سامان تیار ملتا ہے ہتھیاروں وغیرہ کی صفائی باقاعدہ ہوتی رہتی ہے اور ماہرینِ اسلحہ اس سامان کی تکنیکی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں۔ ٹینکوں اور گاڑیوں کو چلا کر دیکھا جاتا ہے۔ ریڈیو سیٹ اور بیٹریاں باقاعدگی سے چیک ہوتی رہتی ہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ عین

وقت پر کوئی وائرلیس سیٹ یا کسی گاڑی کی بیٹری بیکار ہو۔

اسرائیل کی تمام پرائیویٹ بسیں، ٹیکسیاں، کاریں اور ٹرک روزمرہ کے کام کاج میں رواں دواں رہتے ہیں اور اطلاع ملتے ہی محاذ پر پہنچنے کے لئے ہمہ وقت تیار۔ جونہی حکم ملتا ہے، ریزرو فوجی یعنی اسرائیل کے تمام شہری ان پرائیویٹ گاڑیوں میں کود جاتے ہیں اور احکام کے مطابق جہاں پہنچنا ہوتا ہے پہنچ جاتے ہیں۔ گویا پرائیویٹ گاڑیاں ایک لمحے میں فوجی گاڑیاں بن جاتی ہیں۔

کھیتوں میں جو ٹریکٹر چل رہے ہوتے ہیں، وہ حکم ملتے ہی ٹینک بن جاتے ہیں۔ جو ٹریکٹر اس قسم کے نہ ہوں ان کے ڈرائیور ٹینک چلانے لگتے ہیں یا یہی ٹریکٹر ٹینکوں کو گھسیٹنے لگتے ہیں تاکہ محاذ تک پہنچنے کے لئے ٹینکوں کا تیل پٹرول خرچ نہ ہو اور میدانِ جنگ کے لئے بچا رہے۔ یاد رہے کہ وہاں کے ٹریکٹر دراصل ٹینک ہوتے ہیں جنہیں میں پیچھے کہیں 'زراعتی ٹینک' کہہ آیا ہوں۔

دولت کی فراوانی کی بدولت اسرائیل میں پرائیویٹ طیاروں، چھوٹی بڑی لانچوں اور موٹر کشتیوں کی کمی نہیں۔ فیکٹریوں میں بڑے کرین اور جنریٹر ہوتے ہیں۔ یہ تمام سامان ایئرفورس، نیوی اور فیلڈ انجنیئرز کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

تمام ریزرو فوج کے افسر اور سپاہی جو مختلف دفتروں، فیکٹریوں، دکانوں اور کھیتوں میں کام کر رہے ہوتے ہیں بریگیڈوں میں منظم ہو جاتے ہیں۔ ہر بریگیڈ کو نام دیا ہوا ہوتا ہے۔ یہ نام عبرانی زبان میں پکارے جاتے ہیں تاکہ دشمن نہ سمجھ سکے۔ مغربی وقائع نگاروں نے ان بریگیڈوں کے ناموں کو انگریزی میں اس طرح ترجمہ کیا ہے ــــ "ویڈنگ مارچ"۔ "جوائے رائیڈ"۔ "ہولی فلاورز" وغیرہ۔

جون ۱۹۶۷ کی جنگ سے پہلے اسرائیل کے ریڈیو سٹیشنوں سے اس قسم کے اعلان نشر ہوتے سنے گئے تھے کہ فلاں بریگیڈ فلاں جگہ پہنچ جائے اور فلاں شخص فلاں جگہ۔ مثلاً "ویڈنگ مارچ" فلاں محاذ پر۔ محاذوں کے نام کوڈ (خفیہ الفاظ) میں استعمال ہوتے تھے۔ ذرا سی دیر میں تمام کی تمام اسرائیلی قوم، بادردی اور مسلح، کیا مرد کیا عورت، پرائیویٹ بسوں، کاروں، ٹرکوں اور ٹیکسیوں پر مختلف محاذوں پر پہنچ گئی تھی۔ دفتری نظام کو چلانے کے لئے صرف عورتیں رہ گئی تھیں یا ہوم گارڈ، اور شہری دفاع کے لئے وہ لوگ جن کی عمر چالیس سے پچاس برس یا اس سے بھی زیادہ تھی۔

اس منظم قوم نے جون ۱۹۶۷ میں جو کچھ کر دکھایا وہ ساری دنیا نے دیکھا۔ برطانوی امریکی بلاک کی پشت پناہی سے قطع نظر اس قوم نے جس انداز سے اپنے آپ کو منظم کیا اور جنگ میں جس انداز سے اس تنظیم کا عملاً مظاہرہ کیا اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ برطانیہ اور امریکہ نے اپنے مفاد کی خاطر اسرائیل کو تقویت دی لیکن اسرائیلیوں نے اپنے قومی مفاد کی خاطر ان دونوں ملکوں کی صحافت اور نشر و اشاعت کے اداروں پر قبضہ کر لیا اور اس طرح اپنی مکارانہ آواز کو زبان خلق' بنا ڈالا۔

اسلامی نظریۂ جہاد
— چین کے کام آیا

یہ تو اسلامی فلسفۂ دفاع اور نظریۂ جہاد تھا جسے اسرائیلیوں نے اپنا لیا۔ اسی فلسفے کو لائحہ عمل بنا کر آج کی چینی قوم نے بے مائیگی کے باوجود پہلے جاپانیوں کو پھر چیانگ کائی شیک کی امریکی فوجوں کو شکست فاش دی اور آج کے اس چین کا سنگ بنیاد رکھا تھا جو امریکہ اور روس جیسی ایٹمی طاقتوں کو للکار رہا ہے اور دونوں طاقتیں سہمی جا رہی ہیں۔

میں نے اپنی ایک کتاب میں لکھا تھا کہ ماؤزے تنگ نے اسلامی فلسفۂ جہاد کے تحت جنگِ آزادی لڑی ہے اور اس کی کامیابی کا باعث یہی فلسفہ ہے۔ میری یہ کتاب چین تک پہنچ گئی۔ ۱۹۵۸ میں ماؤزے تنگ نے مجھے چینی سفیر کی وساطت سے چین کے دورے کی دعوت دی۔ میں چین گیا۔ چین کی جنگِ آزادی کے نقوش ایک جرنیل کی نگاہ سے دیکھے۔ ماؤزے تنگ سے طویل ملاقاتیں کرنے کے علاوہ میں چین کی دیگر بڑی بڑی شخصیتوں سے ملا۔ ماؤزے تنگ نے مجھ سے پوچھا — "آپ نے یہ کیا بات گھڑ لی ہے کہ چین کی جنگِ آزادی اسلامی نظریۂ حرب کے تحت لڑی گئی تھی۔ یہ تو میرا ذاتی فلسفہ ہے اور تمام کا تمام منصوبہ

میرا اپنا تیار کردہ ہے"۔

میں نے اُسے بتایا کہ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ "ماؤ" کے معنی محمدؐ کے ہوتے ہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ آپ کے آباؤ اجداد مسلمان تھے تو مجھے ذرہ بھر تعجب نہ ہوگا۔

مجھے یاد تھا کہ ماؤزے تنگ نے کسی جگہ ذکر کیا تھا کہ جنگِ آزادی کے دوران اُسے دادا نے خواب میں کہا تھا کہ بیٹا! تمہاری شجاعت، عزم اور حب الوطنی میرے لئے باعثِ مسرت ہے۔ تم نے برسوں تک جرمن اور فرانسیسی فنِ حرب پر عمل کیا مگر ناکام رہے۔ اب اسلامی طریقِ جنگ پر عمل کرو۔

میں نے ماؤزے تنگ کو اس کا یہ خواب یاد دلایا تو اس نے بلا حیل وحجت تسلیم کر لیا۔ پھر میں نے اُسے بتایا کہ آپ کی ہجرت جسے آپ "پچیس ہزار لی لانگ مارچ" 25,000 LI LONG MARCH کہتے ہیں اور جس نے آپ کی کامیابی کی راہیں کھولیں، وہ دراصل ہمارے رسول اکرم صلعم کا فلسفۂ ہجرت ہے۔ رسول اللہ صلعم نے مکہ میں مسلسل کوششوں کے نتائج دیکھ کر بالآخر ہجرت کی اور مدینہ جا کر قوم کو نئی عسکری تربیت دی تھی۔ آپؐ نے عجلت سے گریز کیا اور اس وقت تک دشوار گذار علاقے میں پڑے رہے جب تک قوم کا ہر فرد و بشر جری سپاہی نہ بن گیا۔

پھر میں نے ماؤزے تنگ کو بتایا کہ اسلام پہلا دین ہے جس نے عورتوں کو لونڈیوں اور کنیزوں کے درجے سے نکال کر مردوں کے دوش بدوش کھڑا کیا اور انہیں عسکری تربیت دی۔ رسولِ مقبول صلعم نے عورتوں کو سالار بھی بنایا۔ میں

نے ماؤ کو اُس دَور کی مسلمان عورتوں کی حربی اور انتظامی اہلیت کی تفصیلات سنائیں۔ میں نے اُم کلثوم کا خاص طور پر ذکر کیا جو جنگِ اُحد اور بعد ازاں یہودیوں کے بنو لیطر کے غزوے کے وقت امیرِ مدینہ تھیں۔ میں نے ماؤ کو یہ بھی بتایا کہ اُم عمارہ نے احد کے معرکے میں رسول اللہ کی حفاظت کرتے ہوئے تلوار کے گیارہ زخم کھائے لیکن رسول اللہ صلعم کو آنچ نہ آنے دی۔

رسول اکرم صلعم نے عورت کے دل سے احساسِ کمتری ختم کیا اور فاحشہ عورتوں تک کو پارسا بنا دیا۔ پھر قوم کے اسی مفلوج عضو میں جان ڈال کر اسے جنگی قوت بنا ڈالا۔ میں نے ماؤزے تنگ پر ثابت کر دیا کہ اُس (ماؤ) نے چین کے بازاروں اور قحبہ خانوں سے بیسوا عورتوں کو نکالا اور انہیں عورت کا اصلی روپ دے کر ان میں غیرت اور قومی خودداری پیدا کی۔ یہ فلسفہ بنیادی طور پر اسلامی ہے۔ رسول اکرمؐ نے طلوعِ اسلام کے وقت سب سے پہلے عورت کی طرف توجہ دی تھی اور اسے اس کے اصلی مقام پر لائے تھے۔ اسی عورت نے ان بچوں کو جنم دیا جن کے نعروں نے یورپ کو ہلا ڈالا اور ہلالِ نو کی درانتی سے فصلِ صلیبی کاٹ کر رکھ دی۔

ماؤزے تنگ کی بیوی پہلے گمنام سی ایکٹریس تھی لیکن اب وہ ماؤ کی دستِ راست..... اور نئے چین کی معمار ہے۔ میں نے ماؤ کو یہ بھی بتایا کہ اسلام پہلا بلکہ واحد دین ہے جس نے جنگی قیدیوں کے ساتھ برادرانہ سلوک کی بنیاد ڈالی ورنہ چین اور یورپ میں جنگی قیدی بربریت اور غیر انسانی مظالم کا شکار ہوا کرتے تھے۔ جب مسلمانوں نے جنگی قیدیوں کے ساتھ انسانی سلوک شروع کیا تو اس سے متاثر ہو کر ایرانی، رومی اور مصری سپاہی آ آ کر اسلامی فوجوں میں ملنے لگے۔ اسی

طرح وطن پرست چینیوں نے ماؤزے تنگ کی ہدایت کے مطابق جنگِ آزادی کے دوران اسی اسلامی نظریے پر عمل کیا جس کا اثر یہ ہوا کہ چیانگ کائی شیک کے ہزارہا سپاہی ماؤ کے جھنڈے تلے آ گئے اور ملک کی آزادی کا حصول آسان ہو گیا۔

میں نے چین کی جنگِ آزادی کے اصولوں کو اس لئے قدرے وضاحت سے بیان کیا ہے کہ قارئین اسلامی فلسفۂ جہاد کو عملی میدان میں دیکھ سکیں۔ ویت نامی وطن پرست جو جنگِ آزادی لڑ رہے ہیں۔ اس کے بنیادی اصول بھی اسلامی ہیں اور یہی اصول اسرائیلیوں نے بھی اپنائے اور وہ ان کی بنا پر ہی کامیاب ہوئے۔

اسلام نے عسکری تربیت کو قوم کی یک جہتی اور فلاح و بہبود کے لئے بنیادی مقام دیا ہے اور اسے صرف فوجوں تک محدود نہیں رکھا۔ اسلام کے اوّلین دور میں کوئی باقاعدہ فوج ہوتی ہی نہیں تھی۔ ہر مرد اور عورت اور بچہ بچہ جنگی تربیت سے بہرہ ور تھا۔ جوں ہی ضرورت پڑتی تھی لوگ مسلّح ہو کر اپنے اپنے سالار کے تحت صف آراء ہو جاتے تھے۔ قرآن کا حکم ہے کہ شر اور فساد کو ختم کرنے کے لئے کمر بستہ رہو اور دفاعی جنگ کی تیاری ہر لمحہ جاری رکھو تاکہ اگر دشمن شر و فساد سے باز نہ آئے تو اسے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جا سکے۔

فرانسیسی مؤرخ ریمنڈ لکھتا ہے ــــ "محمدؐ نے اسی پر اکتفا نہ کی کہ مجاہدین کی فوج کو فنِ حرب میں دنیا کی بہترین فوج بنایا بلکہ آپؐ کا دلی مقصد یہ تھا (جسے آپؐ نے پورا کیا) کہ ہر مسلمان اللہ کا سپاہی ہو اور مسلمان قوم اللہ کی فوج کہلانے کے قابل بن جائے۔"

ذرا تاریخ کے اوراق الٹئے اور اسلام کے فلسفۂ جہاد کو میدانِ جنگ میں

کار فرما دیکھ کر یہ سوچیے کہ اس فلسفے میں عورت کا مقام کیا تھا۔ یرموک کا معرکہ تیرانداز عورتوں نے جیتا تھا۔ یرموک میں رومی لشکر مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ تھا اور ان کا جنگی سامان بھی برتر تھا۔ خالد کی فوج پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگئی۔ لیکن عورتوں نے اپنا مورچہ مستحکم کر لیا تھا۔ مسلمانوں کی شکست صاف دکھائی دینے لگی تھی پھر بھی مسلمان عورتوں نے رومیوں پر اس قدر مہلک اور تیز تیراندازی کی کہ رومیوں کی پیش قدمی رک گئی اور وہ دفاعی جنگ لڑنے پر مجبور ہوگئے۔ اس بدلی ہوئی صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خالد نے نئے عزم سے جوابی حملہ کر دیا اور رومیوں کو شکست فاش دینے میں کامیاب ہوگئے۔

تیمور کی مثال لیجیے۔ روسیوں کے خلاف لڑتے تیمور کے پاؤں اکھڑ چلے تھے۔ محاذ کو سنبھالنا محال ہو رہا تھا لیکن تیمور کا 'محفوظ' آڑے آیا۔ یہ تیرانداز عورتوں کا دستہ تھا جسے تیمور نے 'محفوظ' کا نام دیا تھا۔ تیمور نے ایک جنگی چال چلی جس کے تحت وہ 'محفوظ' کو ڈھکی چھپی پوزیشن میں رکھکر دوسرے دستوں کو اس انداز سے پیچھے ہٹانے لگا کہ دشمن اسے پسپائی سمجھ بیٹھا اور اندھا دھند آگے بڑھنے لگا حتیٰ کہ وہ 'محفوظ' کی زد میں آگیا۔ ان تیرانداز عورتوں نے روسیوں کو نرغے میں لے کر تیروں کی بارش کر دی۔ پھر شاید ہی کوئی روسی پیچھے گیا ہوگا۔ تیمور نے معرکہ سر کیا۔

ساتویں صلیبی جنگ ایک عورت نے جیتی تھی۔ یہ ۱۲۴۹ء کا ایک معرکہ ہے جس میں سارا یورپ مسلمانوں کے خلاف طوفان کی طرح اُمڈ آیا تھا۔ کفار کے لشکر میں چھوٹی چھوٹی عیسائی مملکتوں کے علاوہ نو بڑے بادشاہ بھی شامل تھے جن میں فرانس ا

انگلستان، روم اور جرمنی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اسلامی سپاہ کی کمان صلاح الدین ایوبی کے پوتے الکمال کے ہاتھ تھی۔ ایک تو مسلمانوں کی نفری صلیبیوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ دوسرے یہ افتاد آپڑی کہ الکمال شہید ہوگیا۔ اس دور میں سپہ سالار کی موت تمام سپاہ کی مرکزیت ختم کر دیا کرتی تھی جس سے حوصلے بھی پست ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن اسلامی اصول کے مطابق سپہ سالار کی شہادت پر دوسرا سالار کمان سنبھال لیا کرتا تھا۔

جب الکمال شہید ہوگیا تو اس کی بیوی ملکہ شجرۃ الدر نے (جو اس کے ساتھ تھی) کمان سنبھال لی۔ اس جری خاتون نے اپنے کمانڈروں کو پہلا حکم یہ دیا کہ اپنی سپاہ میں کسی کو علم نہ ہونے پائے کہ سپہ سالار شہید ہوگیا ہے۔ ان کے خیمے میں کھانا بدستور جاتا رہے اور خالی برتن واپس آئیں۔ شجرۃ الدر نے اپنے شہید خاوند کی لاش کو چھپا دیا اور اس کی جنگی سکیم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس سکیم اور اپنی جنگی اہلیت کی بدولت اسلام کی اس بیٹی نے اپنے کم لشکر سے سارے یورپ کے لشکر کو ایسی شکست دی جس کی مثال تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

شجرۃ الدر نے عورتوں کو بھی جنگی تربیت دے رکھی تھی۔ اس نے عورتوں کو صلیبیوں کے خلاف لڑایا۔ جنگِ منصورہ میں، قاہرہ کے جنوب میں، مصری فوج نے دشمن کے بڑے بڑے دستوں کو گھیر کر عورتوں سے مروایا تھا۔ بیشتر کفار نے ہتھیار ڈال دیئے تھے جنہیں فدیہ کے عوض رہا کیا گیا تھا۔

مگر آج مصری فوج نے گھیرے میں آکر شکست کھالی ہے جس کی وجہ محض یہ ہے کہ مصریوں نے اسلامی طریقِ جنگ اور حدیثِ دفاع کو فراموش کر کے نہ

اپنے آپ کو پہچانا نہ دشمن کو جانا۔

قوم کے لئے امیر یا امام کا وجود ازبس لازمی ہوتا ہے۔ قرآن کے مطابق اللہ کی راہ پہ نکلنے سے پہلے امام کا انتخاب ضروری ہے۔ قرآن نے امام کی اہلیت اور دیگر اوصاف متعین کر دیتے ہیں جس کے مطابق امیر یا امام کا دولت مند ہونا ضروری نہیں۔ اسے صاحب علم یا عمل ہونا چاہیئے۔ اس میں دوسروں کی نسبت جذبۂ ایثار زیادہ ہو اور وہ نظم و ضبط کی صلاحیت رکھتا ہو۔ قرآن میں آیا ہے —

"فتح یابی کے لئے ضرورت نہ تو اکثریتِ افواج کی ہے نہ کثرتِ مال و زر کی۔ بارہا چھوٹی جماعت کو بڑی جماعت پر غلبہ حاصل ہوا ہے"۔

عرب اسرائیل جنگ اس کی واضح تفسیر ہے۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عرب ممالک میں اتفاق اور اتحاد ناپید ہے۔ ان کے نفاق کی وجوہات کیا ہیں؟ اس کا جواب اس جائزے کے دائرے سے باہر ہے لیکن یہ حقیقت تلخ ہے اور قابلِ غور کہ عربوں کے باہمی نفاق سے مغربی ممالک اور اسرائیل نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

فلسطین کس کا ہے؟
— اور کیوں؟

یہودیوں کا کہنا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو بارگاہِ الٰہی میں باریابی حاصل ہوئی تو اللہ تعالےٰ نے بموجب نئی انجیل یوں فرمایا تھا — "میں تمہیں اور تمہارے وارثوں کو وہ خطہ عطا کر رہا ہوں جہاں پر تم اجنبی کی حیثیت سے وارد ہوئے ہو اور کنعان کی اس سرزمین کے تم اور تمہارے ورثا تا ابد وارث رہیں گے (۱۷: ۸)" — یہودی اسی بناء پر فلسطین کو اپنا مستقل وطن قرار دے کر اس پر قابض ہونے کا حق جتاتے اور دعوے کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ انجیل تو بہت بعد میں لکھی گئی، کیا اسے مستند سمجھا جائے؟

صیہونیوں کا بیان مختصراً یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے۔ ایک حضرت اسحاقؑ جنہیں اہلِ یہود اپنا جدِ امجد قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے فرزند یعقوبؑ سے یہودیوں کی نسل چلی لہٰذا صیہونیوں کا روحانی اور خاندانی وطن فلسطین ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ تھے عرب مسلمان حضرت

ابراہیمؑ کو اسلام کا بانی تسلیم کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کے فرمان کے مطابق اللہ تعالےٰ نے انہیں عربستان کا خطۂ اسلام کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے لئے بخشا ہے۔

صیہونی پروپیگنڈے کے مطابق ـــــ حضرت عیسےٰؑ کی پیدائش سے بہت پہلے فلسطین میں دو طاقتور ریاستیں تھیں۔ ایک اسرائیل دوسری جودیا۔ اندازاً چھ سے آٹھ صدی قبل مسیح میں اسیریا اور بابل نے ان دونوں ریاستوں کو ختم کر دیا۔ یہودی بھاگ کر دنیا کے کونوں کھدروں میں جا آباد ہوئے۔ تقریباً ایک صدی بعد بہت سے یہودی خاندان بیت المقدس میں جمع ہو گئے۔ آخر (یہودیوں کے کہنے کے مطابق) ۱۴۲ قبل مسیح میں انہوں نے اسیریا کو شکست دیکر فلسطین میں ایک بار پھر اپنی حکومت قائم کر لی۔ دس عیسوی میں حکومت روما نے انہیں شکست دیکر ان کی مملکت کو پھر ختم کر دیا اور یہودیوں کے بڑے کلیسا کو منہدم کر دیا۔ انہی کھنڈروں کی ایک دیوار کو وہ "دیوارِ گریہ" WAILING WALL کہتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں مسلمانوں نے ساتویں عیسوی میں روما کو شکست دی اور بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ عہد نامۂ بیت المقدس ایک عظیم کارنامہ ہے جو قرآنی احکامات کی روشنی میں لکھا گیا تھا۔ گیارھویں صدی عیسوی میں صلیبیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو وہاں قتل و غارت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ حد یہ کہ صلیبیوں نے گرجوں کو بھی لوٹا اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں کی بھی بے حرمتی کی۔ صلاح الدین ایوبیؒ نے صلیبی حکمران فرینکس کو شکست دے کر بیت المقدس سے

بے دخل کر دیا۔ اس کے بعد ترکوں نے فلسطین اور حجاز کو فتح کر کے وہاں پھر سے اسلامی حکومت قائم کر دی۔

صیہونیوں کا یہ دعویٰ کہ عرب مسلمان فلسطین پر لمبے عرصے کے لئے حکمران نہیں رہے لہٰذا ان کا اس علاقے پر کوئی حق نہیں، ایسا دعویٰ ہے جیسے یہودیوں کی اپنی تاریخ جھٹلا رہی ہے۔ بیت المقدس پر تھوڑے سے عرصے کے لئے صلیبی حکومت قائم ہوئی تھی لیکن عربوں نے فلسطین کو ترک نہیں کیا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی حکومت کے دوران بہت سے یہودی پھر واپس آ گئے تھے۔ اسلامی حکومت کے تحت یہودی، نصاریٰ اور مسلمان عرب میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ لیکن یہودیوں کا رویہ یہ تھا کہ جہاں مملکت کو بیرونی خطرہ درپیش آیا یا روپیہ کمانے کا لالچ ہوا وہاں انہوں نے دوسرے ملکوں کو ہجرت شروع کر دی۔ اس طرح وہ دنیا بھر میں خصوصاً یورپ میں پھیلے رہے۔ اب ان کا یہ کہنا کہ فلسطین ان کا روحانی گھر ہے، تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تو اس وقت تک فلسطین سے دور رہے جب تک کہ شر پھیلانے کے قابل نہ ہو گئے۔

اہل یہود محنتی، جفاکش اور کفایت شعار ہیں لیکن ان خوبیوں کے باوجود ان میں دولت جمع کرنے کا جنون ایسا ہے کہ ناجائز وسائل سے بھی پیسہ کمانے سے گریز نہیں کرتے۔ اس لحاظ سے یہ قوم بالکل بے اصول ہے۔ اس ذہنیت نے یہودیوں کو اکثر دوسری اقوام کے سیاسی نشیب و فراز میں بھی جا الجھایا اور وہ کسی نہ کسی قوم کے زیر عتاب ضرور رہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں عثمانی ترکیہ زوال پذیر تھی۔ چنانچہ انگریز، جرمن، روسی اور فرانسیسی اس علاقے کو اپنے زیر اثر کرنے

کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ اس وجہ سے اور چند دیگر وجوہات کی بناء پر مشرقی اور وسطی یورپ میدانِ جنگ بنا رہا۔ یہودیوں نے اپنی ساکھ اتنی خراب کر رکھی تھی کہ کوئی قوم انہیں اپنے ساتھ ملانے کو تیار نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے کہیں اور ہجرت کر جانے کی سوچی۔

اسی سوچ کی پہلی کڑی یہ تھی کہ انہوں نے ایک سیاسی انقلابی جماعت بنا لی جس کا نام بیت المقدس کی پہاڑی صیہون ZION کے نام پر صیہونی ZIONISM رکھا۔ یہ جماعت بین الاقوامی یہودیوں کے لئے تھی یعنی کسی بھی ملک کا یہودی اس کا ممبر بن سکتا ہے۔ امریکہ کے یہودی اس جماعت میں کھلے بندوں شامل نہ ہوئے لیکن انہوں نے اس تحریک کو بے تحاشہ مالی امداد دی۔ یورپ میں جنگ و جدل کی وجہ سے وہاں کی تجارتی منڈی بُری طرح متاثر تھی لیکن یہودیوں نے دنیا کے کسی نہ کسی کونے میں اپنی تجارت کو رواں دواں رکھا۔ وہ اب اپنی مستقل اور الگ تھلگ مملکت بنانے کی فکر میں تھے۔ تجارت میں یہودیوں کی کامیابی کو دیکھ کر یورپی تاجر بھی ان سے تعاون کرنے لگے اور یوں ان کی صیہونی جماعت کو مضبوط بناتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ سر موسس مانٹیفورٹ اور پیرس کے بیرن ایڈمنڈ دی روتھ چائیلڈ نے اپنی بیشتر جائیداد اور دولت اس جماعت کے حوالے کر دی۔ اس جماعت کے بنیادی اصول وہی تھے جو صلیبیوں اور نازیوں کے تھے۔ یہ دونوں جماعتیں بھی ملک گیری اور دولت کی ہوس کی خاطر شر پسندی کی بنیاد پر قائم کی گئی تھیں۔ ان کے نزدیک قتل و غارت اور ہر طرح کی بے اصولی جائز تھی۔

چونکہ صیہونیوں کی نگاہ فلسطین پر تھی اس لیئے انہوں نے بے ضرر اور امن پسند مہاجروں کے بہروپ میں فلسطین میں آکر عربوں سے تمام اچھی اچھی اراضی خرید لی اور وہاں فارم بنا لیئے۔ عرب غریب تھے۔ جب ان کے سامنے زمینوں کی اتنی ڈھیر ساری قیمت رکھ دی گئی تو انہوں نے یہودیوں کی اصل نیت کو جاننے کی کوشش ہی نہ کی۔ اس طرح صیہونی فلسطین کی بیشتر زمین کے مالک بن گئے۔ لیکن اراضی کا مالک بن جانے سے وہ فلسطین کے مالک نہیں بن سکتے تھے جو اُن کا منشا تھا۔

اس منشار کی تکمیل کی خاطر انہوں نے یک لخت واویلا بپا کرنا شروع کر دیا کہ عرب فلسطین میں شر اور فساد پھیلا رہے ہیں۔ اس پروپیگنڈے کی آڑ میں انہوں نے عربوں کو پریشان کرنا شروع کر دیا اور انہیں فلسطین سے نکل جانے پر مجبور کرنے لگے۔ حالانکہ فلسطین میں صیہونیوں کے آنے سے پہلے اس سرزمین میں امن وامان تھا۔ ۱۹۵۹ میں ایک یورپی ادارے "انسٹیٹیوٹ آف مڈل ایسٹ" نے اپنی ایک رپورٹ میں یہ الفاظ لکھے تھے ـــــ "کبھی وہ زمانہ تھا کہ مسلم عرب اور یہودی عرب کا تنازعہ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ وہ بھائیوں کی طرح پیار و محبت سے رہتے تھے۔ نویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں یہودی فلاسفی اور یہودیوں کے رسم ورواج کی بقا، اس امر کا ثبوت ہے۔ یہودیوں نے مسلمانوں کے دوش بدوش فتوحات بھی حاصل کیں۔ مسلمان حکمران یہودیوں کے عالموں کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے"۔

ہیبریو یونیورسٹی کا چیئرمین ایس ڈی کوئیتین، اس رپورٹ سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتا ہے ـــــ "پانچویں سے تیرھویں عیسوی تک مسلمان عربوں اور یہودیوں

کے تعلقات برادرانہ تھے"۔ بہت سے مغربی مبصروں نے بھی لکھا ہے کہ پہلی جنگ عظیم تک مسلمان عربوں اور یہودیوں میں کوئی تنازعہ نہ تھا۔ حیفہ، بیت المقدس اور جافہ کی میونسپل حکومتوں میں دونوں تعاون اور ملنساری سے کام کرتے تھے۔ ۱۹۱۹ میں شریف کے بیٹے امیر فیصل کے ساتھ ڈاکٹر وزمین نے حجاز کے علاقے میں صیہونیوں کے داخلے کی عام اجازت کے دوستانہ معاہدے پر دستخط کئے تھے مگر اس معاہدے کے اثرات مسلم عربوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئے۔ برطانیہ نے عثمانی ترکی کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لئے کرنل لارنس اور فلبی کے ہاتھوں عرب نیشنل ازم کو جنم دیا۔ ۱۹۱۷ میں بالفور اعلان نے وہ تمام پردے اٹھا دیئے جو عربوں کی آنکھوں اور عقل پر پڑ گئے تھے مگر حالات ان کے خلاف اور ان کے بس سے باہر ہو چکے تھے۔ برطانیہ نے صیہونیوں کو مسلح کر دیا تھا اور انہیں زمین دوز دہشت پسند جماعت بنا دیا تھا۔

بن گوریئن —

یہودیوں کا گورو

صیہونیوں کا روحانی لیڈر بن گوریئن ۱۶ دسمبر ۱۸۸۶ کو پولینڈ کے ایک قصبے پلوسک میں پیدا ہوا۔ اُن دنوں پولینڈ زارِ روس کی حکمرانی میں تھا۔ روسی پولینڈ والوں کو "پولش کتے" کہا کرتے تھے۔ وہاں یہودیوں کی حالت خاصی بُری تھی۔ انہیں

معاشرے میں کوئی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ برطانوی منصوبے کے تحت بن گورئین صیہونیوں کی ایک جماعت کے ساتھ فلسطین گیا۔ اس وقت اس کی عمر بیس (۲۰) سال تھی۔

یہاں یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ ۱۹۰۲ میں برطانیہ کے سیکرٹری نوآبادیات جوزف چیمبرلین نے یوگنڈہ (افریقہ) کا تمام علاقہ صیہونیوں کو بطور تحفہ بخش کیا تھا تاکہ وہ اس خطے کو اپنا وطن بنالیں لیکن صیہونیوں نے یہ پیشکش ٹھکرادی اور فلسطین کو زیادہ پسند کیا۔ ابھی فلسطین پر ترکوں کی حکمرانی تھی اس لئے صیہونی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگے۔

بن گورئین نے برطانوی صیہونی فنڈ کی مدد سے گیلیلی میں بہت سی اراضی خریدی اور محنت و مشقت سے اسے اعلیٰ درجے کا زراعتی فارم بنا ڈالا۔ فوراً کئی ہزار صیہونیوں نے فلسطین میں اراضی خریدلی اور فارم بنا لئے۔ وہ بے ضرر اور امن پسند کسانوں اور زمینداروں کے بھیس میں ترکوں کے خلاف برطانیہ کے آلۂ کار بن گئے۔ بن گورئین نے ایک زیر زمین دہشت پسند جماعت بنائی جس کا نام ہگانہ رکھا۔ تمام صیہونیوں پر لازم تھا کہ اس جماعت کے ممبر بنیں۔ اس جماعت کے ہر ممبر کو فوجی تربیت دینے کے علاوہ جاسوسی، مخبری، دہشت پھیلانے اور چوری چھپے قتل کرنے کے طور طریقے سکھائے جانے لگے۔ یہ تربیت عربوں کے خلاف دی جارہی تھی۔

صیہونیوں کی اس دہشت پسند جماعت کے اصول اسمٰعیلی قاتلوں ASSASSINS سے ملتے جلتے تھے۔ قاتلوں کی اس جماعت کا مرکز دسویں سے چودھویں صدی عیسوی تک شام میں رہا۔ یہ لوگ سیاسی بنا پر اپنے آپ کو فاطمی حکومت کے شیعہ کہلاتے تھے لیکن ان کے نظریات میں اسلام کی ہلکی سی جھلک بھی نہیں تھی۔ اس جماعت کا خاتمہ ہلاکو خان نے کیا تھا۔

یہودیوں کی جماعت "ہگانہ" کے ممبر متعصب اور کٹر قسم کے صیہونی تھے۔ ان کا اہم ترین مقصد یہ تھا کہ صیہونی مذہب کو عبرانی زبان میں نیا جنم دیا جائے۔ برطانیہ اس جماعت کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا، اس لئے برطانوی حکومت نے کمانڈو اور گوریلا جنگ کے ایک ماہر کپتان ونگیٹ کو اس مقصد کے لئے فلسطین بھیجا کہ وہ صیہونیوں کو گوریلا جنگ کی ٹریننگ دے اور انہیں اس قابل بنا دے کہ اسرائیلی اپنے زورِ بازو سے وہاں حکومت قائم کر لیں اور برطانیہ پس منظر میں ہی رہے۔ اس وقت موشے دایان کی عمر صرف انیس برس تھی۔ وہ بن گورئین کی ہگانہ جماعت کا سرگرم رکن تھا اور دہشت پسندی میں اس قدر ماہر کہ ذرا سے عرصے میں بن گورئین کا دستِ راست بن گیا۔

میں برطانوی کپتان ونگیٹ کو دوسری جنگِ عظیم میں برما فرنٹ پر ملا تھا۔ اس وقت تک وہ صیہونیوں کو گوریلا اور کمانڈو کے فن میں ماہر بنا چکا تھا۔ میں ونگیٹ کے ساتھ کچھ عرصہ برما فرنٹ پر رہا تو اس کے ساتھ دوستانہ بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ وہ اب کپتان نہیں میجر جنرل تھا اور گوریلا فوج کو لیکر جاپانیوں کے خلاف گوریلا جنگ لڑنے گیا تھا۔ برما کی وادیوں اور جنگلوں میں جاپانی بڑی مضبوطی سے قدم جما چکے تھے اور ہندوستان خطرے میں تھا۔ ونگیٹ کو گوریلا جنگ اور جنگل کی لڑائی کا جینئس GENIOUS مانا جاتا تھا۔ اس نے اپنے فن سے جاپانیوں کے پاؤں اکھاڑ دیئے اور وہیں مارا گیا تھا۔

جب میں ونگیٹ سے ملا اس وقت تک اس بات کا کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ اسرائیلیوں کو گوریلا جنگ کی باقاعدہ ٹریننگ دیتا رہا ہے۔ اس نے خود مجھ سے ذکر کیا اور بڑے فخر سے کہا کہ میں نے اسرائیلیوں کو دنیا کے بہترین گوریلا لڑاکے بنا دیا

ہے۔ اس نے اسرائیلیوں کی بہت تعریف کی اور کہا ــــ "میں نے ان جیسے ذہین، باعزم، تعلیم یافتہ اور فرض شناس افسر اور سپاہی کہیں نہیں دیکھے تھے۔ انہوں نے دہشت پسندی کی تربیت قومی فریضے کے طور پر حاصل کی اور یہی ان کی کامیابی کی وجہ ہے۔"

موشے دایان نے کہا تھا ــــ "ہر اسرائیلی سپاہی ونگیٹ کا شاگرد ہے۔ ہم اُسے اپنا پیر و مُرشد مانتے ہیں۔ اُس نے ہمیں کامرانی کی راہ دکھائی ہے۔"

بن گورئین کے دماغ میں یہی ایک جنون تھا ــــ یہودیوں کو بحیثیت قوم منظم کرنا اور اپنا وطن بنانے کے قابل بنانا۔ اس نے اسلامی فلسفۂ جہاد کو اپنا لیا اور حضرت شاہ سلیمانؑ کی طرز کی جنگی تیاریاں کرنے لگا۔ جس طرح حضرت سلیمانؑ نے میگیڈو کو اپنا دفاعی مرکز بنا کر وہاں اسلحہ اور دیگر جنگی سامان کا ذخیرہ رکھا تھا اور ایسا انتظام کیا تھا کہ ذرا سی دیر میں یہ سامان محاذوں تک پہنچایا جائے، اسی طرح بن گورئین نے راشن پانی، اسلحہ، وردی اور دیگر جنگی سامان کے زمین دوز سٹور اور میگزینیں بنالیں۔ پھر ایسے ٹریکٹر تیار کروا لئے جو بوقت ضرورت ٹینک بن جاتے ہیں لیکن یہ بعد کی ترقی ہے۔

اپریل ۱۹۲۰ء میں فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان پہلا فرقہ وارانہ فساد ہوا جس کی وجہ ان اسرائیلیوں کی زمین دوز مجرمانہ سرگرمیاں تھیں۔ آئے دن سرکردہ عرب پُراسرار طریقے سے قتل ہو رہے تھے۔ عربوں کو ایک تو بالفور اعلان نے دوسرے ویزمین امیر فیصل معاہدے نے جھنجھوڑا اور وہ کسی حد تک بیدار ہو گئے۔ اس پہلے فساد میں پانچ صیہونی مارے گئے اور تقریباً دو سو زخمی ہوئے۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران برطانیہ نے عربوں اور ترکوں میں پھوٹ ڈال کر عربوں

بن گوریتن

جنرل ونگیٹ

کو سبز باغ دکھائے تھے۔ اب عربوں نے انگریزوں کو اپنے وعدے پورے کرنے کو کہا۔ وہ تو انگریزوں کی بدمعاشی تھی، وعدے کیسے؟ انگریزوں نے بن گورین کی دہشت پسند جماعت ہگانہ کو عربوں کے خلاف استعمال کیا اور اگست ۱۹۲۹ میں عربوں اور اسرائیلیوں میں پھر فساد کرا دیا۔ اب کے بھی اسرائیلیوں کا ہی زیادہ نقصان ہوا کیونکہ اسرائیلی ابھی پوری طرح جنگی تیاری نہیں کر پائے تھے۔

اس موقع پر برطانیہ نے اپنے ماہر ترین گوریلا لڑاکے ونگیٹ کو فلسطین بھیجا تاکہ وہ صیہونیوں کو درپردہ ٹریننگ دے کر عربوں کے خلاف تیار کرے۔ ونگیٹ نے یہ کام کر دیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ برطانیہ نے کرۂ ارض پر ایک فتنہ تخلیق کر ڈالا ہے جو آگے چل کر امن عالم کے لئے مستقل خطرہ بنا رہے گا۔

صیہونیوں کو مزید تقویت دینے کے لئے لارڈ پیل نے ۱۹۳۷ میں فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اُدھر ہٹلر اور زارِ روس نے یہودیوں کو اپنے ملکوں سے دھتکارنا شروع کر دیا۔ وہاں سے نکلے ہوئے یہودی فلسطین پہنچ گئے۔ یہ سب صیہونی تھے۔ کہنے کو فلسطین میں داخلے پر پابندیاں تھیں لیکن یہ لوگ راتوں کو کشتیوں میں یا خشکی کی راہ بھیس بدل کر یا اسی طرح کے مجرمانہ طریقوں سے فلسطین میں داخل ہوتے اور صیہونیت میں ہی اضافہ نہ ہوا بلکہ ہگانہ کی نفری بھی بڑھ گئی۔ انہوں نے دہشت امد قتل و غارت سے عربوں کو وہاں سے نکالنا شروع کر دیا۔ اس وقت عالمی ادارہ لیگ آف نیشنز ایک بے اثر اور محض برائے نام ادارہ تھا۔ کسی قوم نے توجہ ہی نہ دی کہ فلسطین میں کیا ہو رہا ہے حالانکہ یہ ایک بین الاقوامی اہمیت کا مسئلہ تھا اور آگے چل کر یہ مسئلہ اور اُلجھ سکتا تھا جیسے آج یہی مسئلہ عالمی امن کے لئے خطرہ بنا ہوا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹) شروع ہوئی تو صیہونی بن گوریئن کے اصولوں کے تحت ونگیٹ کی شاگردی میں مکمل جنگی ٹریننگ حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے موقع شناسی سے کام لیتے ہوئے اتحادیوں کے دوش بدوش جرمنوں کے خلاف لڑنے کی پیشکش کر دی اور ہگانہ کے تیئیس ہزار (۲۳،۰۰۰) تربیت یافتہ رضاکار برطانوی فوج کے حوالے کر دیئے جو جرمنوں اور اطالویوں کے خلاف لڑے۔ جب جرمن فوجیں جنرل روميل کی قیادت میں بحیرۂ روم پھلانگ کر افریقہ میں داخل ہو گئیں تو وہاں اتحادیوں کی پوزیشن کمزور ہو گئی۔ ہگانہ نے اپنے چنے ہوئے گوریلے اور زمین دوز لڑاکے افریقہ بھیج دیئے جنہوں نے اتحادیوں کی خاصی مدد کی۔ اسی طرح جب فرانس جرمنی کے قبضے میں تھا تو وہاں ہگانہ کی دو خفیہ جماعتیں "ارگن" اور "سٹرنسٹ" بھیجی گئیں جنہوں نے زمین دوز طریقوں سے تباہی اور قتل و غارت سے جرمنوں کو بہت نقصان پہنچایا۔

اتحادیوں نے اسرائیلیوں سے فائدہ اٹھایا تو اسرائیلیوں نے اتحادیوں اور جنگِ عظیم سے فائدہ اٹھایا اور جدید قسم کا بے اندازا اسلحہ اور بارود اُن کے ہاتھ آ گیا علاوہ ازیں ان کے افسر اور سپاہی جنگ، زمین دوز جنگی کارروائیوں اور گوریلا لڑائیوں کے اور زیادہ ماہر بن گئے۔

اس کے مقابلے میں عرب دقیانوسی ہتھیار لئے بیٹھے رہے۔ جنگ کی وجہ سے اسرائیلی ہر لحاظ سے مالا مال ہو گئے مگر عرب قحط سالی اور آمدنی میں کمی کا شکار ہوئے۔ بن گوریئن نے ہگانہ کو اب ایسی قومی جماعت بنا لیا جس میں شریک ہونا اور اسکی شرائط اور قواعد و ضوابط کو تسلیم کرنا ہر اُس یہودی پہ لازم تھا جو فلسطین میں آباد ہونا چاہتا ہے۔ جب ۱۹۴۸ میں صیہونیوں کو "اسرائیل" کے نام سے وطن مل گیا تو ایشکول وزیرِ اعظم بنا۔

اس نے ہر مرد اور عورت کے لئے فوجی اور جنگی تربیت لازمی قرار دے دی (اس کی تفصیلات بیان کر آیا ہوں)۔ اس تربیت سے دودھ پلاتی مائیں، حاملہ عورتیں، پاگل مرد یا عورت مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں اور عرب نژاد لوگ خواہ وہ یہودی یا عیسائی ہی کیوں نہ ہوں ہگانہ میں شریک نہیں ہو سکتے۔

اسرائیل کی سالانہ آمدنی چار سو کروڑ اسرائیلی پونڈ ہے جس کا گیارھواں حصّہ دفاع پر صرف ہوتا ہے۔ چونکہ حاضر فوج بہت کم رکھی جاتی ہے اس لئے دفاعی اخراجات زیادہ نہیں ہوتے۔ بوقتِ ضرورت ساری قوم میدانِ جنگ میں پہنچ جاتی ہے۔ اس وقت بن گوریئن کی عمر اکیاسی (۸۱) برس ہو گئی ہے۔ وہ ۱۹۶۳ میں وزارتِ عظمیٰ سے سبکدوش ہو گیا تھا اور یہ عہدہ اشکول نے سنبھال لیا تھا۔ اس بڑھاپے کے باوجود وہ قوم کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرتا رہتا ہے۔ اس کی بیوی اب بھی اس کے لئے اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتی ہے۔ اس کے مرجانے سے اسرائیل میں کوئی کمی واقع نہیں ہو گی۔ وہ قوم کی بنیادیں بہت مضبوط کر چکا ہے اور قوم کو ایسی راہ پہ ڈال چکا ہے جس سے صیہونی اتنی آسانی سے بھٹک نہیں سکیں گے جس قدر عرب سمجھے بیٹھے ہیں۔

میں یہاں ایک بار پھر یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بن گوریئن نے کوئی نئی راہ نہیں سوچی تھی۔ اس نے قرآنی تعلیمات کو سامنے رکھ کر ہگانہ کی بنیاد رکھی تھی اور اس نے قوم کی بقاء اور ملک کے دفاع کے لئے جو منصوبہ تیار کیا تھا وہ اسلامی حدیثِ دفاع ہے۔ بن گوریئن نے ان اسلامی نظریات میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کیا ہے تو یہ کہ عیاری اور فریب کاری کو بھی قومی مفاد کی خاطر جائز قرار دے دیا ہے

ایشکول

صیہونیوں کا یہ لیڈر، یوکرین (روس) کے ایک گاؤں خیوا میں ۲۵ اکتوبر ۱۸۹۵ کو پیدا ہوا اور اس کا نام لیوی شکولنک رکھا گیا۔ اس کا باپ اس علاقے کا مشہور عالم تھا۔ خاندان آسودہ حال تھا لیکن ایشکول کا شعور بیدار ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ آسودہ حالی تو ہے مگر روس میں یہودیوں کی عزت و آبرو نہیں ہے۔ روس اور جاپان کی جنگ کے دوران یہودیوں کو ان کی بے اصولی کی وجہ سے مظالم کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ جب ایشکول کی عمر انیس برس ہوئی تو وہ (۱۹۱۴) میں جافہ چلا گیا۔ اس کے پاس صرف دو چار جوڑے کپڑے تھے۔ وہ اپنے کنبے اور روس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ آیا تھا۔ جافہ میں آتے ہی اُسے صیہونیوں نے اپنی جماعت میں شامل کر لیا اور اُسے ایک فارم میں کام دے دیا گیا۔ محنت اور ذہانت کی بدولت اس نے فارم کو خاصی ترقی دی اور آبپاشی کے لئے پمپ لگا دیئے۔ وہ دن بھر فارم پر کام کرتا اور شام کے بعد فارم پر کام کرنے والے ساتھیوں کے لئے کھانے وغیرہ کا انتظام کرتا۔ تھوڑے عرصے بعد اُس کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے اُسے بیت المقدس کے قریب بیک وقت

دو فارموں پر لگا دیا گیا۔ جماعت نے اس کا نام لیوی کی بجائے عبرانی زبان میں ایشکول رکھ دیا جس کے معنی انگور کے گچھے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اب وہ صرف ایشکول کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

پہلی جنگِ عظیم میں ایشکول ہگانہ کے ساتھ بن گورئین کے ماتحت جرمنوں کے خلاف لڑا۔ میدانِ جنگ میں اس نے بن گورئین کے دل میں جگہ پیدا کر لی اور دونو گہرے دوست بن گئے۔ جنگ کے بعد وہ بیت المقدس کے ایک مضافاتی گاؤں میں چلا گیا اور امدادِ باہمی کے اصول پر ایک فارم قائم کیا۔ خلوص، ملنساری اور محنت کے باعث وہ لوگوں میں ہر دلعزیز بن گیا۔ اسرائیل کے قیام کے بعد بن گورئین نے اُسے ۱۹۵۱ء میں اپنی کابینہ میں محکمۂ زراعت کا وزیر بنا دیا اور ۱۹۵۲ میں اُسے وزارتِ خزانہ سونپ دی۔ یہ ایشکول کے دماغ کا کرشمہ ہے کہ اُس نے ۱۹۶۲ میں اسرائیلی پونڈ اور امریکی ڈالر کے جھگڑے کو ختم کیا اور اسرائیلی پونڈ رائج کیا تھا۔

۱۹۶۳ میں ایشکول بن گورئین کی جگہ وزیرِ اعظم بنا۔ اُس نے وزارتِ عظمیٰ ایشکول کے حوالے کرکے اُسے نصیحت کی تھی ——— "ہر موقع پر صلح و صفائی کی کوشش نہ کرنا۔ صلح جوئی سے بعض کام مشکل ہو جایا کرتے ہیں" ——— لیکن ایشکول کا نظریہ مختلف تھا۔ وہ جنگ پر پُرامن حل کو ترجیح دینے کا قائل تھا۔ مصر نے جب خلیج عقبہ کی ناکہ بندی کی تو بھی ایشکول سفارتی ذرائع سے اس مسئلے کو حل کرنا چاہتا تھا لیکن ہگانہ اور صیہونیت طاقت سے بات منوانے کی قائل ہے اور صیہونی لیڈر صلح جوئی اور اعتدال پسندی کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسرائیلیوں کی تمام تر کامیابیاں زورِ بازو اور تلوار کا حاصل ہیں۔ اس وقت ایشکول کے سوا تمام صیہونی لیڈر ایشکول کے نظریۂ

امن کے خلاف ہیں۔

ایشکول کے اس نظریے کے باوجود عربوں اور دیگر اسلامی مملکتوں کو یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ آخر صیہونی ہے اور ہر صیہونی اپنی قوم کے مفاد کے لئے اپنے ذاتی نظریات اور کردار تک کو قربان کر دینے کو جائز سمجھتا ہے۔

ایبان

ایبان فلسطین میں صیہونی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم کیمبرج یونیورسٹی میں حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اُسے ہگانہ میں باقاعدہ فوجی تربیت دی گئی اور اسے اس مشن پر برطانیہ بھیج دیا گیا کہ حکومت برطانیہ کو آمادہ کرے کہ فلسطین کو یہودی مملکت تسلیم کرے اور دوسرے ملکوں سے بھی تسلیم کرائے۔ ایبان اس مشن میں پوری طرح کامیاب تو نہ ہو سکا لیکن اس نے برطانیہ کی آمادگی خاصی حد تک حاصل کر لی تھی۔ بن گورین نے اس کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے اسے اقوام متحدہ کے کمشن میں اسرائیل کا رابطہ افسر مقرر کر دیا۔ یہ نہایت اہم جگہ تھی جہاں ایبان اقوام متحدہ کے نمائندوں اور مبصروں کو اپنے حق میں گمراہ کر سکتا تھا۔

۱۹۴۸ کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد اُس نے ۱۹۴۹ میں اقوام متحدہ میں

ایشکول

ایبان

اسرائیل کی نمائندگی اور وکالت ایسی خوبی سے کی کہ اسرائیلیوں کا بس اور زیادہ مضبوط ہوگیا۔ اس قابلیت اور کارنامے کی بدولت اسرائیلی حکومت نے اُسے اقوامِ متحدہ میں اپنا مستقل سفیر بنادیا۔ اس وقت اس کی عمر پینتیس (۳۵) برس تھی۔

ایبان بھی عربوں اور اسرائیلیوں میں پُرامن تصفیئے کا قائل تھا بلکہ اس نے عربوں کے ساتھ سمجھوتے کی کوشش بھی کی مگر بن گورئین اور دوسرے اسرائیلی وزراء امن کے قائل نہیں تھے۔ یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ ایبان نے سفارت سے استعفیٰ دے دیا اور اس نے میپائی MAPAI پارٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے انتخاب لڑا اور کامیاب ہوگیا۔ اُسے اسرائیلی حکومت میں وزیرِ بے محکمہ بنادیا گیا۔

۱۹۶۶ میں اسرائیل کی وزیرِ خارجہ گولڈا مائیر نے استعفیٰ دیا تو وزارتِ خارجہ ایبان کو دے دی گئی مگر عرب دوستی کے الزام میں اُسے پھر نرغے میں لے لیا گیا۔ اسرائیلی جنگ پسندی کے اصول سے دستبردار نہیں ہو سکتے کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو قومی حیثیت سے دہشت پسندی، فتنہ پروری اور جنگ پسندی کے اصولوں پر تربیت دی ہے۔ لہٰذا اکیلے ایبان کا صلح جُو ہونا اسرائیلیوں کی ذہنیت کو بدل نہیں سکتا۔

موشے دایان

اسرائیلیوں کا وزیرِ جنگ موشے دایان ۲۰ مئی ۱۹۱۵ کو دا گنیا کے علاقے

کبوتر تو زمین پیدا ہوا۔ یہ اردنی علاقہ بحرِ گیلیلی کے جنوب میں واقع ہے اور مرطوب گرمی کی وجہ سے مشہور ہے۔

دایان چھ برس کا تھا جب اس کے والدین نہالال کے سیم زدہ علاقے کو امدادِ باہمی کے اصولوں پر آباد کرنے کے لئے گئے۔ انہوں نے اس علاقے میں فارم قائم کئے اور بہت محنت کی۔ دایان نے بارہ برس کی عمر میں کاشت کاری شروع کر دی تھی اور چودہ برس کی عمر میں وہ بن گوریئن کی ہگانہ جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ذہانت کی بدولت وہ سکاؤٹ بن گیا۔ اس کا کمال یہ تھا کہ وہ بدو لٹیروں کی نقل و حرکت دیکھتا رہتا تھا اور جہاں کہیں وہ حملہ کرنے کو جائیں وہاں کے لوگوں کو پہلے ہی خبردار کرتا تھا۔

اس کی عمر ابھی انیس برس بھی نہیں ہوئی تھی کہ برطانوی گوریلا کپتان ونگیٹ اسرائیلیوں کو ٹریننگ دینے کے لئے آ گیا۔ دایان اس کا سب سے زیادہ ہوشیار شاگرد ثابت ہوا۔ تین سال کے عرصے میں اس نے ونگیٹ کے فن میں اس قدر مہارت حاصل کر لی کہ اسے ونگیٹ کا سیکنڈ ان کمانڈ بنا دیا گیا۔ تھوڑے عرصے بعد ونگیٹ اپنا مشن مکمل کر کے برطانیہ چلا گیا تو اس کی جگہ دایان نے لے لی۔ اس کی زندگی کا اب یہی ایک مقصد تھا کہ دہشت اور قتل و غارت سے عربوں کو فلسطین سے بیدخل کیا جائے۔ برطانوی حکام اس سلسلے کے حادثات کی مذمت کرتے رہے لیکن ان کے تدارک کے لئے کوئی کارروائی نہیں کی۔

صیہونی فلسطین کو اپنا وطن بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہاں انہیں انگریزوں کی موجودگی بھی گوارا نہیں تھی۔ ہگانہ کے دہشت پسندوں نے انگریزوں کو بھی

نشانہ بنایا۔ یہودی بے اصول تو ہوتے ہی ہیں انہوں نے برطانیہ کی نوازش سے اُن کے ونگیٹ جیسے قابل ترین افسر سے جنگی تربیت حاصل کی مگر فن میں ماہر ہوکر انگریزوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگے۔ حکومتِ برطانیہ نے ۱۹۳۹ کے آغاز میں دایان کو پانچ برسوں کے لئے قید کر دیا۔

اسی سال ستمبر کے مہینے میں ہٹلر نے عالمی امن کو تہس نہس کر دیا اور ۱۹۴۱ میں اس نے یورپ سے اتحادیوں کو نکال باہر کیا۔ اس وقت برطانیہ کو زمین دوز لڑاکوں اور گوریلوں کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ بن گورئین ہزاروں یہودیوں کو برطانوی افواج میں بھرتی کر چکا تھا جو جرمنوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ حکومتِ برطانیہ نے بن گورئین سے گوریلا لڑاکے مانگے۔ انگریزوں نے یہودیوں کو دہشت پسندی اور جاسوسی کے گُر سکھائے تھے۔ بن گورئین نے اس شرط پر برطانیہ کو مطلوبہ آدمی دینے کا وعدہ کیا کہ دایان کو رہا کر دیا جائے۔

جرمنوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے ان پر عقب سے وار کرنا لازمی تھا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر برطانیہ نے بن گورئین کی شرط مان لی اور دایان کو رہا کر دیا۔ دایان نے پچاس چنے ہوئے صیہونی ساتھ لئے اور عربوں کا لباس پہن کر شام کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ اس وقت شام پر وِشی فرانس کی حکومت تھی جو دراصل نازیوں کی کٹھ پتلی حکومت تھی۔ دایان نے شام میں نازی فوج کے متعلق کامیاب جاسوسی کی اور برطانوی کمانڈر انچیف کو نہایت قیمتی معلومات بہم پہنچائیں۔ جب برطانیہ نے شام پر حملہ کیا تو دایان ساتھ تھا۔ لبنان کی جنگ میں بھی وہ برطانوی فوج کی راہنمائی کر رہا تھا۔ دریائے لیٹنی کے کنارے ایک معرکے میں گولی یا گولے کے

ٹکڑے سے اس کی بائیں آنکھ ضائع ہوگئی۔ ہسپتال سے فارغ ہوکر وہ فیلڈ مارشل ویول کے ساتھ لیبیا کی لڑائی میں شامل ہوا۔ اس کی کامیابیوں اور جنگی اہلیت کے پیشِ نظر اُسے بریگیڈیئر بنا دیا گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو وہ تجربہ کار فوجی افسر کی حیثیت سے فلسطین چلا گیا اور کاشت کاری میں مصروف ہوگیا۔

۱۹۴۸ میں برطانیہ نے فلسطین سے انتداب ختم کرنے کا اعلان کیا تو ہگانہ نے عرب لیگ کے مقابلے میں اپنی فوج کو جنگ کے لئے میدان میں اتار دیا اور اس کی کمان دایان کو دی۔ ہگانہ کا یہ پورے کا پورا بریگیڈ جیپ گاڑیوں کا تھا جن سے یہ بریگیڈ ہر طرح کی زمین پر اچھی رفتار سے حرکت کر سکتا تھا۔ تمام جیپوں پر مشین گنیں نصب تھیں۔ دایان نے عربوں پر نہایت تیز حملے کر کے نجف کے علاقے سے عربوں کو دھکیل دیا۔ پھر پیش قدمی کر کے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔

۱۹۴۹ میں دایان نے فوجی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے اردن کے ساتھ جنگ بندی کے معاہدہ پر دستخط کئے۔ اس کے بعد اُسے برطانیہ کے سینئر آفیسرز سٹاف کالج میں اعلیٰ تربیت کے لئے بھیج دیا گیا۔ اس تربیت کے دوران اُسے اسرائیلی فوج کا میجر جنرل بنا دیا گیا اور ۱۹۵۲ میں سٹاف کالج سے پاس ہوکر آ گیا۔ ہگانہ کے کمانڈر کی حیثیت سے اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے تمام فوجی افسروں کے لئے کمانڈو COMMANDO اور چھاتہ بردار PARATROOPER کی ٹریننگ لازمی قرار دے دی۔ دنیا میں شاید ہی کسی ملک کے تمام کے تمام فوجی افسر کمانڈو اور چھاتہ بردار ہوں۔

۱۹۵۵ میں پیراشوٹ سے چھلانگ لگانے کی مشق کرتے دایان کی ایک

ٹانگ ٹوٹ گئی لیکن جلدی صحت یاب ہو گیا۔ اس نے جرمنی کے مشہور فوجی مفکر اور مبصر وان کلاز وٹز کے فنِ حرب اور امریکہ کی فضائی فوج کے جنگی اصولوں کو یکجا کر کے ان میں اسلامی حدیثِ دفاع کو شامل کر لیا اور ایسی سٹریٹیجی تخلیق کی جسے وہ اپنی اختراع سمجھتا ہے۔

وہ قابل جرنیل ہی نہیں بلکہ سیاسیات کا بھی ماہر شاطر ہے۔ وہ ۱۹۵۸ میں فوج سے سبکدوش ہو گیا اور ۱۹۵۹ میں بن گورئین نے اُسے وزیر زراعت بنا دیا۔ زرعی ترقی میں اُس نے یادگار کام کیے۔ جب بن گورئین نے وزارتِ عظمیٰ سے استعفا دیا تو دایان بھی الگ ہو گیا اور حزبِ مخالف 'رافی پارٹی' سے جا ملا۔ مبصروں کا خیال ہے کہ وزارت سے علیحدگی کی وجہ ایشکول (وزیراعظم) کی اعتدال پسند پالیسی تھی۔ دایان جنگ پسند تھا اور عربوں کے خون کا پیاسا۔ وہ اعتدال کے سخت خلاف تھا۔

۱۹۶۷ کے آغاز میں جب مشرقِ وسطیٰ پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے تو ایشکول نے اُسے نائب وزیراعظم اور مشیر دفاع بننے کی پیشکش کی لیکن دایان نے یہ شرط پیش کی کہ اگر مجھے وزارت میں شامل کرنا ہے تو مجھے وزارتِ جنگ دی جائے۔ صیہونیوں کے آپس میں کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں، قومی وقار کی خاطر وہ تمام اختلافات الگ رکھ دیتے ہیں اور ایک محاذ پر جمع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ عربوں کے خلاف جنگ لڑنے کے لئے دایان نے وزارتِ دفاع سنبھال لی اور اسرائیلی فوج کی کمان بھی اپنے ہاتھ میں لے لی۔

دایان نے جنگی منصوبہ دیکھا اور اس میں کئی تبدیلیاں کیں۔ اُس نے اُن تمام علاقوں اور مورچوں کا دورہ کیا جہاں اُسے جنگ لڑنی تھی۔ اس کے ان دوروں

اور سرگرمیوں کو تو صیغۂ راز میں رہنا ہی تھا، وزارتِ دفاع میں اس کی شمولیت کو بھی صیغۂ راز میں رکھا گیا تاکہ عربوں کو کسی قسم کا شک نہ ہو۔

جب صدر ناصر نے اقوامِ متحدہ کی بین الاقوامی افواج کو مصر کی چوکیاں خالی کرنے کو کہہ دیا تو دایان نے جنگ کی سکیم مکمل کر لی اور حکومت سے منوا لیا کہ سب سے پہلے حملہ کر کے سنائی صوبہ پر قبضہ کر لیا جائے تاکہ ہم درّہ تیران (خلیج عقبہ) میں عربوں کے ساتھ جہاز رانی کے متعلق سودا بازی کر سکیں۔ اس طرح کی اور بہت سی باتیں تھیں جو دایان نے اندر ہی اندر طے کر لیں مگر جب اخباری نمائندوں سے بات ہوئی تو اس نے اس قسم کا گمراہ کن بیان دیا کہ خلیج عقبہ کی ناکہ بندی کے متعلق میرا کوئی بھی بیان محض قبل از وقت ہوگا۔ دراصل چاہیے تو یہ تھا کہ خلیج عقبہ کی ناکہ بندی کے معاً بعد ہم عربوں پر حملہ کر دیتے۔ اب ہمیں سفارتی بات چیت کی بین الاقوامی کوششوں کے نتیجے کا انتظار کرنا ہوگا۔ اسی پریس کانفرنس میں دایان نے یہ بھی کہا کہ ہمارے سپاہی تو چھٹی پر ہیں کیونکہ وہ جنگ کی نسبت کھیتی باڑی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اس بیان کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ عربوں نے اسے سچ مان لیا اور مطمئن ہو گئے کہ اسرائیلی جنگ کے لئے تیار نہیں۔

دایان اور اس کے چند ایک اعلیٰ افسر ویت نام بھی گئے۔ وہاں انہوں نے امریکی لیفٹیننٹ جنرل لوئیس والٹ سے تبادلۂ خیالات کیا اور امریکی طریقۂ جنگ کو نہایت غور سے دیکھا تھا۔ جنرل والٹ نے دایان کے متعلق کہا تھا:۔

"اگر دایان دشمن کی فوج کا کمانڈر ہو تو میں اُسے بہت خطرناک سمجھوں گا۔ ایسے قابل کمانڈر کی دوستی بہت قیمتی ہے"۔

موشے دایان

ریبن

جون ۱۹۶۷ کا جنگی پلان تو زیادہ تر دایان کا تھا لیکن ریبن کمانڈر انچیف تھا۔ اس نے زراعتی سکول میں تعلیم حاصل کی تھی اور اٹھارہ سال کی عمر میں ہگانہ میں شامل ہو گیا تھا۔ جب دوسری جنگِ عظیم میں بن گوریون نے ہگانہ کے صیہونیوں کو برطانوی فوج میں بھرتی کرایا تو ریبن بھی فوج میں شامل ہو گیا اور جرمنوں کے خلاف لڑا۔ ذہانت اور جفاکشی کی بدولت ۱۹۴۴ میں میجر بنا دیا گیا۔

فوجی عموماً چہرے مہرے سے پہچان لئے جاتے ہیں خواہ وہ کیسا ہی لباس کیوں نہ پہنے ہوئے ہوں لیکن ریبن کا چہرہ کچھ ایسا بھولا بھولا سا ہے کہ کسی کو شبہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ کٹر دہشت پسند اسرائیلی ہے اور فنِ حرب کا ماہر کمانڈر۔ اس نے جنگِ عظیم میں کمانڈو کی حیثیت سے انتہائی خطرناک کارنامے کر دکھائے اور اس جنگ سے بہت کچھ سیکھا، جسے اس نے اپنی فوج میں بھی رائج کیا۔ صیہونی افسروں میں یہی خوبی ہے کہ وہ کہیں بھی ایسی بات دیکھیں جو ان کی قوم کی فلاح یا دفاع کے کام کی ہو اسے اپنا لیتے ہیں۔

جنگِ عظیم کے بعد ریبن صیہونیوں کی اس زمین دوز دہشت پسند جماعت میں شامل ہو گیا جس کے ذمے عربوں کو قتل و غارت کے ذریعے فلسطین سے بھگانے کی مہم تھی۔ ریبن

ربین

آرتھر گولڈبرگ

نے فلسطین میں مقیم انگریزوں کو بھی قتل کرنا شروع کر دیا۔ ایک بار اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ پکڑا گیا تو حکومتِ برطانیہ نے ان سب کو چھ چھ ماہ کے لئے جیل میں بند کر دیا۔ لیکن جنگِ عظیم شروع ہو گئی تو اُسے برطانوی فوج میں شامل ہونے کے لئے رہا کر دیا گیا۔

۱۹۴۸ میں جب اسرائیل اور عربوں کا تصادم ہوا تو رَبین جنوبی سیکٹر کا چیف آف اپریشن تھا۔ اُس نے نجف اور بیت المقدس کی لڑائیوں میں خاصا نام پیدا کیا۔ ۱۹۵۴ میں اسے بریگیڈیئر بنایا گیا اور ۱۹۵۶ میں جب اسرائیلیوں اور مصریوں کی ایک بار پھر شدید ٹکر ہوئی تو رَبین شمالی سیکٹر کا کمانڈر تھا۔ وہ کامیابی اور شجاعت سے لڑا اور مصریوں کو پیچھے دھکیل دیا۔

دایان کی طرح رَبین کو بھی برطانیہ کے سینئر آفیسرز سٹاف کالج میں بھیجا گیا تھا۔ وہاں سے تربیت حاصل کر کے اُسے امریکہ بھیجا گیا جہاں اس نے ٹیکساس کے سٹاف کالج (بلس فورٹ) میں جدید جنگ کی تربیت حاصل کی۔

اس برطانوی اور امریکی تربیت کے بعد وہ جون ۱۹۶۷ میں عربوں کے خلاف لڑا۔

آرتھر گولڈ برگ

گولڈ برگ ۸ اگست ۱۹۰۸ کو شکاگو (امریکہ) کے ایک صیہونی گھرانے میں پیدا

ہوا۔ اس کا باپ گاڑی بان تھا۔ گولڈ برگ تین برس کا ہوا تو اس کا باپ آٹھ بچے چھوڑ کر مر گیا۔ بارہ برس کی عمر میں گولڈ برگ نے جوتے بنانے والی ایک فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ تعلیم بھی حاصل کرتا رہا اور قانون کی ڈگری حاصل کر لی۔ ۱۹۲۹ میں وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا اور اس قدر کامیابی حاصل کی کہ سینیٹر منتخب ہو گیا۔

۱۹۵۰ میں اس کی ملاقات امریکہ کے سابق صدر آنجہانی کینیڈی سے ہوئی تو وہ گولڈ برگ کی ذہانت اور سیاست دانی سے بہت متاثر ہوا۔ کینیڈی صدر بنا تو اس نے اُسے لیبر کے محکمے کا سیکرٹری بنا دیا۔ بعد میں وہ سپریم کورٹ کا جج مقرر ہوا۔ گولڈ برگ کی خصوصی خوبی یہ ہے کہ وہ سیاسی جوڑ توڑ، شاطرانہ چالوں اور جھگڑے نمٹانے میں مہارت رکھتا ہے۔

اُسے اقوام متحدہ میں امریکہ کے نمائندے کی حیثیت سے بھیجا گیا تو مصر کے اخبار "الجمہوریہ" نے سوال کیا تھا کہ ایک صیہونی کو امریکہ کا نمائندہ کیوں چنا گیا ہے؟ کسی امریکی اخبار یا سرکاری ترجمان نے اس سوال کا جواب نہ دیا۔ بیروت کے اخبار "الشہاب" نے ایک اداریے میں لکھا تھا — "امریکی صدر نے یہ انتخاب اس لئے کیا ہے کہ جانسن نے اپنے پیش رو ٹرومین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صیہونیوں کی سرپرستی کی ذمہ داری لے لی ہے اور ان کے حقوق کے تحفظ کا بیڑا بھی اٹھا لیا ہے۔ امریکی حکومت کی یہ صیہونیت نواز پالیسی اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس تباہی کا شکار اکیلا جانسن ہی ہو"۔

اقوام متحدہ میں آرتھر گولڈ برگ کی حیثیت امریکی نمائندے کی ہے لیکن جب عرب اسرائیل مسئلے کے متعلق بولتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ امریکی نہیں اسرائیلی نمائندہ بول رہا ہے۔

جمال عبدالناصر

مصر کا موجودہ صدر جمال عبدالناصر شمالی افریقہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں بنی مور میں ۱۵ جنوری ۱۹۱۸ کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ ڈاکخانے میں کلرک تھا۔ باپ متوسط گھرانے کا آدمی تھا۔ پھر بھی اُس نے بچے کی تعلیم پر خرچ کرنے سے گریز نہ کیا اور اُسے قاہرہ کے ایک سکول میں داخل کر دیا۔ سکول سے فارغ ہوا تو ناصر کو ملٹری اکیڈیمی بھجوا دیا۔ وہ ۱۹۳۷ میں پاس آؤٹ ہوا تو اُسے فوج میں کمشن مل گیا۔ مصر کا ایک طبقہ شاہ فاروق کے خلاف انقلاب کی تحریک کا آغاز کر چکا تھا۔ ناصر اور اس کے ساتھ کے چند اور نوجوان فوجی افسر اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ ان افسروں نے ۱۹۴۵ میں "آزادی پسند افسران" کی ایک خفیہ جماعت بنالی اور ناصر کو جماعت کا لیڈر منتخب کر لیا۔

۱۹۴۸ میں پہلے عرب اسرائیل تصادم میں ناصر فیلوگا کے محاذ پر بٹالین کمانڈر کی حیثیت سے لڑا۔ ایک معرکے میں وہ شدید زخمی ہو گیا۔ پھر بھی اس نے مورچہ نہ چھوڑا اور اسرائیلیوں سے پوری جھڑپ لی۔ اس کارنامے کی وجہ سے اُس کے ساتھیوں نے اُسے "شیرِ فیلوگا" کا خطاب دے دیا۔ اس کی خفیہ جماعت کے افراد اسے "سردار" یا BOSS

کے نام سے پکارتے تھے۔

یہ جنگ مصریوں کی توقع کے خلاف ناکام ثابت ہوئی اور شاہ فاروق کی شاہانہ ذہنیت اور زیادہ بے نقاب ہو گئی تو ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ کو ناصر کی جماعت "آزادی پسند افسران" نے شاہ فاروق کو تخت سے دستبردار کر دیا اور اُسے ملک سے ہی نکال دیا۔ اس خاموش اور کامیاب انقلاب کی قیادت مصر کے جنرل محمد نجیب نے کی تھی۔ نجیب، بہادر اور نڈر قائد تھا۔ مصر کی صدارت نجیب کو سونپ دی گئی لیکن انقلابی جماعت نے اُسے معزول کر دیا کیونکہ اس کے خلاف یہ الزام تھا کہ اُس نے شاہِ فاروق کو چند ایک مراعات دینے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ بھی کہ اُس نے معزول شہنشاہ کو بہت سی دولت ساتھ لے جانے کی اجازت دی تھی حالانکہ سرکاری خزانے کو ایک ایک پیسے کی ضرورت تھی۔

ناصر چست و چالاک اور ہنس مکھ انسان ہے۔ وہ صدر ہونے کے باوجود ابھی تک اُسی سرکاری مکان میں رہتا ہے جہاں وہ کرنل کی حیثیت سے رہا کرتا تھا۔ اُس کے پڑوس میں دوسرے فوجی افسر رہتے ہیں۔ اس کے بیوی بچے معمولی سی کار استعمال کرتے ہیں جو سرکاری نہیں، ان کی اپنی ہے۔ گھر میں ناصر مشفق باپ اور اچھا شوہر ہے۔

جب ناصر نے مصر کی صدارت سنبھالی تو ملک کی معاشرتی حالت پر شاہ فاروق کے اثرات باقی تھے۔ حکومت کی مشینری نااہل اور سست رفتار تھی۔ رشوت ستانی بھی کھلے بندوں چلتی تھی۔ کسان طبقہ زبوں حال تھا۔ ملکی صنعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ تعلیم بھی نہیں تھی کیونکہ بادشاہ عوام کو گنوار رکھکر ہی اطمینان سے تخت پر بیٹھ سکتا تھا۔

ناصر نے بیشتر جاگیروں، فیکٹریوں اور بینکوں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ اس نے

زرعی ترقی کے لئے اسوان بند کا منصوبہ بنایا تو امریکہ نے اپنی شرائط پیش کر کے اس بند کے لئے مالی امداد کی پیش کش کی لیکن ناصر نے روس سے امداد لے لی اور اسوان بند تعمیر ہو گیا۔ اس طرح ناصر نے کئی ترقیاتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا۔ بیشتر مبصروں کا خیال ہے کہ ناصر ان منصوبوں میں پوری طرح کامیاب نہیں لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آج کا مصر شاہ فاروق کے دورِ بادشاہی کے وقت سے بہت خوشحال ہے۔ اگر مصر کو وقتاً فوقتاً جنگ میں نہ الجھایا جاتا تو یہ ملک کہیں زیادہ خوشحال اور جدید ہوتا لیکن ناصر کا اشتراکی بلاک سے وابستہ رہنے کا فیصلہ مصر کے لئے مہنگا ثابت ہو رہا ہے۔ برطانوی امریکی بلاک مصر کی ترقی کی راہ میں دشواریاں پیدا کرنے کے لئے اپنے اُس فتنے کو استعمال کر رہا ہے جسے اُس نے اسرائیل کے نام سے عرب دنیا کے وسط میں قائم کیا تھا۔ آئے دن کی سرحدی جھڑپیں اور جون ۱۹۶۷ کی جنگ مصر کو اقتصادی معذوریوں میں مبتلا کر چکی ہے۔ ۱۹۵۶ میں اس بلاک کا نہر سویز پر کھلا حملہ مصر کے ترقیاتی منصوبوں کو ابتدا میں ہی ختم کر دینے کے لئے کافی تھا۔

مغرب والوں کا خیال تھا کہ مصری حکومت نہر سویز جیسی عالمی شاہراہ کا انتظام نہیں سنبھال سکے گی لیکن مصری حکومت نے اس نہر کو دو طرفہ ٹریفک کے قابل بنا دیا اور آمدنی میں اسّی (۸۰) ہزار پونڈ سے بیس لاکھ پونڈ تک کا اضافہ کر لیا۔

جہاں برطانوی امریکی بلاک مصری حکومت کو کمزور کرنے کی کوشش کر رہا ہے وہاں روس اُسے فوجی اور مالی امداد دے رہا ہے لیکن اس سوال کا جواب ابھی تک نہیں ملا کہ کیا روس مصر کی اُسی طرح مدد کرے گا جس طرح امریکہ نے اسرائیل کی کی تھی۔

جمال عبد الناصر

مارشل عبد الحكيم عامر مرحوم

مارشل عبدالحکیم عامر مرحوم

متحدہ عرب جمہوریہ کا مرحوم نائب صدر اور ڈپٹی سپریم کمانڈر مارشل عبدالحکیم عامر ۱۱ دسمبر ۱۹۱۹ کے روز اسطال میں پیدا ہوا۔ تحصیلِ علم کے دوران اُسے سیاسیات سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ عمر ابھی سولہ برس تھی جب وہ عملاً اپنے ملک مصر کی ایک سیاسی تحریک میں شامل ہو گیا۔ اس وقت یعنی ۱۹۰۵ میں ۱۹۳۰ کے آئین کی تنسیخ اور ۱۹۲۳ کے آئین کے دوبارہ نفاذ کے سلسلے میں مصر کے گوشے گوشے میں مظاہرے ہو رہے تھے۔ عامر اس تحریک کا سرگرم رکن رہا۔ پھر ملٹری اکیڈیمی میں داخلہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۹۳۹ میں پاس آؤٹ ہوا تو اُسے سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے مصری فوج کی انفنٹری میں بھیج دیا گیا۔ ۱۹۴۰ میں سوڈان میں تھا جب اس کی ملاقات موجودہ صدر ناصر سے ہوئی۔ مشترک خیالی کی بدولت دونو گہرے دوست بن گئے۔

عامر کی فوجی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ اُسے لیفٹیننٹ کی حیثیت سے سٹاف کالج میں بھیجا گیا۔ وہ پہلا لیفٹیننٹ تھا جسے سٹاف کالج میں بھیجا گیا تھا۔ جب وہ کامیاب ہو کر نکلا تو ملک کی اقتصادی اور سیاسی کیفیت بہت بُری تھی اور دن بہ دن بگڑ رہی تھی۔

اس کا ردِ عمل فوجی افسروں تک جا پہنچا۔ چند وطن پرست افسروں نے "آزادی پسند افسران" کے نام سے ایک خفیہ جماعت جمالی جس کا قائد ناصر تھا۔ عامر بھی اس جماعت میں شامل ہو گیا۔ یہ جماعت ملک میں انقلاب کے لئے زمین ہموار کرنے لگی۔ عامر اس مہم میں پیش پیش تھا۔

آخر ۱۹۵۲ میں ان کی جدوجہد رنگ لائی اور شاہ فاروق کو معزول اور جلاوطن کر دیا گیا۔ عامر اسی زمانے میں جنگ فلسطین میں شدید زخمی ہوا لیکن لڑتا رہا۔ اُسے میجر بنا دیا گیا۔

جون ۱۹۵۳ میں عامر کو مصری فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا۔ اس کی عمر چونتیس (۳۴) برس تھی۔ ۱۹۵۶ میں اسے مصر، شام، سعودی عرب اور یمن کی متحدہ افواج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا۔ فروری ۱۹۵۶ میں اسے متحدہ عرب جمہوریہ کا نائب صدر بھی بنایا گیا۔ مارچ ۱۹۶۴ میں اسے متحدہ عرب جمہوریہ کا نائب صدر اول اور مسلح افواج کا ڈپٹی سپریم کمانڈر بنا دیا گیا۔ ان ذمہ داریوں کے علاوہ عامر اسوان بند کی تعمیر کے سلسلے میں اقتصادی کمیٹی کا چیئرمین بھی تھا۔ پھر اُسے صدارتی کونسل کا ممبر بھی بنایا گیا۔

جون ۱۹۶۷ کی جنگ میں متحدہ عرب جمہوریہ کی ناکامی کے بعد عامر نے تمام عہدوں اور مناصب سے استعفےٰ دے دیا۔ تھوڑے دنوں بعد اُسے صدر ناصر کی حکومت کا تختہ الٹنے کے الزام میں اُس کے گھر میں نظر بند کر کے اس کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔ اس نے مطالبہ کیا کہ اس کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ خیال تھا کہ اُس کے خلاف اور پچاس اور افسروں کے خلاف کورٹ مارشل ہو گا لیکن عامر نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ اس نے اخباری رپورٹوں کے مطابق ۱۳ ستمبر کے روز

خواب آور گولیاں کھالی تھیں اور ۱۴ ستمبر ۱۹۶۷ کو مر گیا۔

ابھی کسی عدالت نے یہ فیصلہ نہیں دیا تھا کہ آیا عامر کسی جرم کا مرتکب ہوا تھا یا نہیں۔ جہاں تک جون ۶۷ کی جنگ میں عربوں کی ناکامی کا تعلق ہے اس کی ذمہ داری عامر پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ ذرا اس کی مصروفیات اور سرکاری عہدے اور ذمہ داریاں دیکھئے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ڈپٹی سپریم کمانڈر کی حیثیت سے اُسے اپنی فوجوں کو قریب سے دیکھنے کے لئے چند لمحے بھی میسّر آتے ہوں گے ؟ نہ صرف یہ کہ وہ فوجوں کی ٹریننگ کی طرف توجہ نہ دے سکا بلکہ اس کی اپنی جنگی صلاحیتیں زنگ آلود ہوتی رہیں۔

جیسا کہ میں پیچھے واضح کر آیا ہوں، اسرائیل کو پالنے والی مغربی طاقتیں عربوں کی اندرونی چپقلش سے خوب فائدہ اُٹھا رہی ہیں۔ عامر کے سلسلے میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ امریکہ کے یہودی جریدہ "ٹائم" نے حال ہی میں عامر کا ایک فرضی وصیت نامہ شائع کیا ہے۔ اس ہفت روزہ جریدے نے دنیا سے اپنا نقطۂ نگاہ منوانے کے لئے اس فرضی وصیت نامے کے ساتھ خوب رنگ آمیزیاں کی ہیں اور دعوے کیا ہے کہ اُس نے یہ "وصیت نامہ" عرب ممالک کی خفیہ پولیس کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ بعض عرب حلقوں نے تصدیق کی ہے کہ "وصیت نامہ" عامر کا ہی ہے۔

اس "وصیت نامہ" میں "ٹائم" نے اس قسم کی باتیں لکھی ہیں کہ "عربوں کی شکست کا ذمہ دار ناصر ہے۔ میں (عامر) نے کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن ناصر اپنے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتا ورنہ میں دنیا کو بتا دیتا کہ عربوں نے کیوں شکست کھائی ..... ہم نے اسرائیل سے بلاوجہ جنگ کی ....." وغیرہ۔

اب امریکی یا برطانوی پریس اور نشری اداروں کو کوسنا محض بے سود ہے۔ مصری خود اپنے خلاف پروپیگنڈے کا مواد فراہم کر رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ صدر ناصر "ٹائم" کے اس مفروضے کا کیا جواب دیتا ہے۔

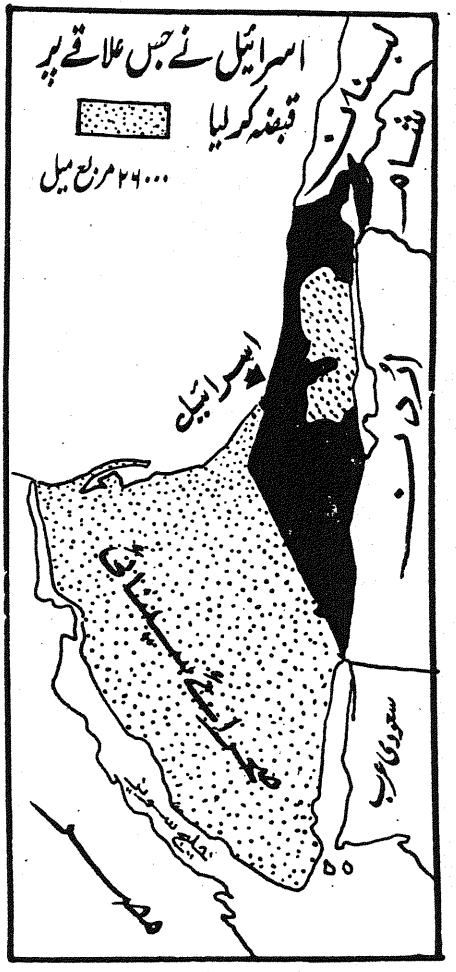

اسرائیل نے جس علاقے پر
قبضہ کرلیا
۲۶۰۰۰ مربع میل
لبنان
شام
اسرائیل
اردن
صحرائے سینائی
سعودی عرب
خلیج سویز
مصر

محشرِ فلسطین

حصّہ دوم

خورشید عالم

دنیا کا مرکز ــــ تاریخ کی جنگاہ

اہلِ فلسطین، خواہ وہ کسی نسل سے متعلق کیوں نہ رہے ہوں، آغازِ تاریخ سے ہی جنگوں سے دوچار رہے ہیں۔ انسانی تاریخ کوئی زیادہ طویل نہیں، بمشکل چھ سات ہزار سال کا حساب ہوگا۔ تاریخ کی روشنی وقت کے اندھیروں کو اور روشن کر سکے تو بھی فلسطین جنگ و پیکار میں ہی الجھا دکھائی دے گا۔ جغرافیہ نے اس ملک کو، کہ جس کا رقبہ بمشکل سابق پنجاب کے چار اور سندھ کے دو اضلاع کے برابر ہوگا، کچھ ایسا مقام بخشا ہے کہ یہ حقیر سا ملک کبھی امن و اطمینان سے نہ رہ سکا۔ نقشۂ عالم پر نگاہ ڈالنے سے یہ روشن ہو جائے گا کہ ایسا ناگزیر تھا۔

منضبط تاریخ کے آغاز سے ہی فلسطین معلوم دنیا کا مرکز تھا۔ اس کے مشرق میں ایشیا تھا، مغرب میں یورپ، شمال میں پھر یورپ اور ایشیا اور جنوب میں افریقہ۔ یہ ساری کی ساری معلوم دنیا تھی۔ شمالی ساحل کے علاوہ سارا افریقہ غیر مساحت شدہ

اور غیر معلوم تھا۔ شمالی اور جنوبی امریکاؤں اور آسٹریلیا ایسے وسیع وعریض ارضی حصص کی موجودگی کا گمان تک بھی نہ تھا۔ نقشے پر یورپ تھا، اور وہ بھی جنوبی اور مشرقی، شمالی افریقہ مشمولہ مصر اور ایشیا۔ اس معلوم دنیا کے عین وسط میں ایک معمولی حصّہ زمین، انگلستان کے علاقہ ویلز کے برابر فلسطین۔ معلوم دنیا میں قومیں ابھرتی اور مٹتی رہیں۔ چین، وادی سندھ، اسیریا، بابل، مصر، فارس، یونان، روما۔ ان اقوام کے عروج وزوال کے لئے باہمی تصادم ناگریز تھا۔ ان بین الاقوامی معرکوں کے طوفان اس حقیر سے زمینی ٹکڑے کو بے دردی سے روندڈالتے رہے۔ اس کے حیات ومطالبات دھرے کے دھرے رہ جاتے اور اس کے باشندے کچل دیئے جاتے۔ فلسطین کے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہا کہ وہ اُس کا حلیف ہو یا اِس کا حریف، وہ کس کی مدد کرے اور کس سے استمداد۔ اس کا فیصلہ اور انتخاب کچھ بھی ہو، نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔

امن کے زمانے میں فلسطین، بین الاقوامی، تجارتی قافلوں کی گذرگاہ تھا اور جنگ کے زمانہ میں عساکر وجیوش کی آماجگاہ۔ فلسطین بری اور بحری شاہراہوں پر تھا۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ فلسطین کے ذریعے باہمی تجارت کرتے تھے۔ امن کی حالت میں فلسطین فارغ البال رہتا اور جنگ کے دوران وہ تباہ ہوجاتا۔ اس کی قومی آزادی وخودمختاری ناقابلِ حصول ہی رہی۔ ایسے مواقع پڑ کر متحارب فریق برابر قوت کے مالک ہوتے تھے، فلسطین کسی ایک طرف ہوکر پانسہ پلٹ دیتا تھا۔ اس وقت اہلِ فلسطین کی حقیر امداد بھی متعلقہ فریق کا پلڑا بھاری کردیتی لیکن یہ اہمیت خطرناک تھی۔ وہ حریف یا حلیف بن کر آسان جنگاہ بن جاتا رہا۔

حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل (مردخدا) تھا۔ آپ کی اولاد سے جو نسل آگے

بڑھی، اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے کا نام یہوداہ JUDA تھا۔ یہودہ اور بن یامین کی نسل کا قبیلہ فلسطین کے علاقہ موسومہ یہودہ میں سلطنت کرتا تھا۔ اسی نسبت سے اُنہیں یہودی کہا جانے لگا اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل۔ آہستہ آہستہ یہ تفریق بھی جاتی رہی۔ چنانچہ اب بنی اسرائیل اور یہودی کا ایک ہی مفہوم لیا جاتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کا وطن کنعان (فلسطین) تھا۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے اپنے والد بزرگوار اور تمام قبیلہ کو مصر بُلا لیا تھا۔ حضرت یوسفؑ کی وجہ سے ان کی مصر میں بڑی تعظیم و تکریم ہوئی۔ چار سو برس تک یہ مصر میں رہے سہے یہیں بڑھے، پھُولے پھلے۔ جو قبیلہ چند نفوس پر مشتمل تھا، اس عرصے میں عظیم الشان قوم بن گیا۔ فرعونِ مصر ان کی بڑھتی ہوئی قوت و کثرت سے خائف ہوا کہ مبادا وہ اس کے دشمنوں سے مل کر کوئی سازش برپا کر دیں۔ اس لئے اس نے اُنہیں کچلنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ یہ حکم دے دیا گیا کہ بنی اسرائیل کی کثرت کو روکنے کے لئے ان کے بیٹوں کو ہلاک کر دیا جائے اور بیٹیاں زندہ رہنے دی جائیں۔ حضرت موسیٰؑ کہ آلِ اسرائیل کے اولوالعزم پیغمبر ہیں، اس عالم میں دارالسلطنت میں پیدا ہوئے جب کہ بنی اسرائیل کے بچوں کی ہلاکت کا انسانیت کش حکم نافذ تھا۔ مشیتِ ایزدی نے آلِ اسرائیل کے اس فرزند کو نہ محض ہلاکت سے بچایا، بلکہ شاہی محلات میں اس کی پرورش کا سامان کر دیا اور اس کے بعد طور کی وادیوں میں آزاد تربیت کا انتظام۔ وہاں سے لوٹ کر انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو ملک چھوڑ دینے کی اجازت دی جائے۔ یہودیوں کی اپنی روایات (عہد نامہ عتیق) کے مطابق حضرت موسےٰؑ کے بعد جوشوا کی قیادت میں بنی اسرائیل نے فلسطین کو بزورِ شمشیر فتح کیا اور قدیمی باشندوں کو ملک بدر کر دیا یا ان کا خاتمہ کر دیا۔ جدید مؤرخین اس

نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے کہ قدیم باشندے بالکلیہ نیست ونابود ہو گئے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ کبھی بھی مکمل طور پر فتح نہیں ہو سکے بلکہ مفتوحہ علاقے میں آباد رہے اور بنی اسرائیل سے ازدواجی تعلقات میں منسلک ہو گئے۔ ایچ۔ جی ویلز نے اپنی کتاب ______

THE OUTLINE OF HISTORY میں لکھا ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ موعودہ سرزمین کبھی بھی مکمل طور پر عبرانیوں کے قبضہ میں رہی ہے۔ انجیل کی متفرق کتابوں میں باختلافِ واقعات تاریخ کو دہرایا گیا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ PHILISTINES جنوب کی زرخیز زمین پر قابض رہے اور شمالی حصے میں کنعانی اور فونیشین اسرائیلیوں کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔

اسرائیلی، شبانی اور زرعی عادات کے مالک تھے، مگر ان میں سپاہی بھی تھے۔ مفتوح (یا ہنوز غیر مفتوح) پر رحم کرنا، ان کے نزدیک یہودہ کے خلاف گناہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے پیشرو مالکان زمین کو ختم نہ کر دینا ادائے فرض میں ناکامی کے مرادف سمجھتے تھے۔ یہودیوں کی موجودہ خصائل —— شہروں میں بسنا، مالیات وتجارت میں مہارت وغیرہ —— ان کے اسرائیلی اسلاف کی خصائل ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی سفک دم کی تفسیر ہے۔ بعد میں وہ کاشتکار اور زراعت پیشہ رہے نہ کہ مدنی معمار۔ حضرت سلیمانؑ کے تزک واحتشام کے باوجود عہد نامہ عتیق کی داستان، مکانات اور محلات کے بجائے، گیہوں، انگور، زیتون، بھیڑوں اور بیلوں کی داستان ہے۔ خدا کے لئے ان کے ہاں عزیز ترین نام "شبان" (گڈریا) ہے۔

حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ آلِ اسرائیل کے جلیل القدر بادشاہ تھے اور پیغمبر

بھی۔ حضرت داؤدؑ نے پہلی مرتبہ گیارہویں صدی قبل مسیح میں یروشلم کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اور حضرت سلیمانؑ نے دسویں صدی میں بیت المقدس کے پہلے ہیکل کی تعمیر کرائی۔ یہ زمانہ بنی اسرائیل کے اوجِ کمال کا زمانہ تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں ان کی شان و شوکت انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد انحطاط کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے بعد بارہ اسرائیلی قبائل میں سے دس نے فلسطین کے شمالی حصہ میں "سلطنتِ اسرائیل" کا قیام کیا۔ باقی دو یعنے جوڈہ اور بن یامین کے قبائل بدستور جنوب میں تختِ داؤد کے وفادار رہے۔

یوں تو یہود کی تباہی کی داستان کی ہر کڑی عبرت انگیز ہے لیکن ان پر دو مرتبہ ایسی ہلاکت آفریں بربادی کی نعمت طاری ہوئی جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے قبل نہ دیکھی تھی۔ قرآن نے ان دو مواقع کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہر بربادی ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی، بلا جرم سزا نہیں تھی۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا (۱۷/۴)

اور (دیکھو) ہم نے کتاب (یعنی تورات) میں بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خبر دے دی تھی کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ خرابی پھیلاؤ گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی کرو گے۔

تورات میں بھی بنی اسرائیل کی ان دو بڑی تباہیوں کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ کوئی ۷۲۱ ق م میں شمالی فلسطینی حکومت پر اشوریوں نے قبضہ کر لیا تھا اور باشندوں کو قید کر کے لے گئے تھے۔ تاریخ ان کے انجام کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ اس

حادثہ کے کوئی ایک صدی بعد بابل کے شاہ بخت نصر نے "جنوبی حکومت" کو تہ و بالا کر دیا۔ یروشلم کی، کہ یہودیوں کا دینی اور سیاسی مرکز تھا، اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ قتل و غارت گری اور سلب و نہب کا یہ ایسا جاں گداز مرقع تھا جو تاریخ عالم میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ اس سے نہ صرف بنی اسرائیل کی سلطنت ہی تباہ ہوئی بلکہ ان کی قومیت کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی اور غلامی و محکومی، ہلاکت و بربادی کی بڑی سے بڑی مصیبتیں جو کسی قوم پر آ سکتی ہیں سب یکجا ہو گئیں۔ بخت نصر نے یروشلم کو لوٹا، جلایا، یہودیوں کا قتل عام کیا اور بقیۃ السیف کو قید کر کے اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ یہ سانحہ ایسا المناک اور دل سوز تھا کہ بابل کی اسیری کے زمانے میں یہودیوں کے انبیاء ان کی اس زبوں حالی پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ اسارت کا یہ زمانہ شاہ فارس کے ہاتھوں ختم ہوا۔ جب ساٹھ سال کے بعد سائرس نے دریائے فرات اور بحر روم کا درمیانی علاقہ فتح کر لیا تو یہودیوں کو فلسطین واپس جانے کی اجازت دے دی۔ شاہ یا شاہانِ فارس نے یروشلم کی دوبارہ آبادی اور ہیکل کی از سرِ نو تعمیر کی بھی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۵۳۷ سے ۵۱۵ ق م کے دوران ہیکل پھر تعمیر ہو گیا اور مُردہ یہودی قوم نے پھر زندگی حاصل کی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر سے وہی حالت ہو گئی اور وہ اسی پستیِ زندگی کی طرف لوٹ آئے جس کی پاداش میں ان کی پہلی بربادی ظہور میں آئی تھی۔ فارس کے زیرِ اقتدار یہودیوں نے جو تھوڑی بہت آزادی حاصل کی تھی، سکندر یونانی نے ۳۳۲ ق م میں اس پر ضرب کاری لگائی اور فلسطین کی آزادی کالعدم مسلوب کر لی۔ ۳۲۰ ق م میں بطلیموس نے مصر کے راستے حملہ کیا اور یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ یونانیوں (مصری بطلیموسوں) نے یہودیوں پر خوب مظالم کئے۔

حتیٰ کہ ۶۳ ق۔م میں اس دوسری اور آخری تباہی کی تمہید شروع ہوگئی جن کا ذکر صحفِ یہود میں اور جن کے آثار ان کی پیشانیوں میں جھلک رہے تھے۔ پامپی (رومی) آگے بڑھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس تاخت و تاراج میں تقریباً بارہ ہزار یہودی تباہ ہوگئے۔ ۵۱ ق م کے قریب ایک اور یورش میں تیس ہزار یہودی غلام بنا لئے گئے۔ وہ ڈھور ڈنگر کی طرح فروخت ہوئے۔

فطرت کی طرف سے انہیں بازآفرینی کا ایک اور موقع دیا گیا اور ان میں حضرت عیسٰیؑ مبعوث ہوئے لیکن یہودیوں نے حضرت عیسٰیؑ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ایک دنیا پر روشن ہے۔ اس اتمام حجت کے بعد ان کی آخری بربادی کا وقت آگیا۔ رومیوں نے ۷۰ میں ایک ایسا وار کیا جس نے اس بدبخت قوم پر ابدی ہلاکت کی مہر ثبت کردی۔ اس کے بعد یہ قوم مسلسل دشت پیمائیوں اور صحرانوردیوں میں ذلیل و خوار رہی ہے۔

قبل مسیح بعد مسیح میں بدل گیا لیکن یہودیوں کے مصائب میں کمی نہ ہوئی۔ ۱۳۵ میں شاہ ہیڈرین نے یروشلم پر قبضہ کر لیا اور اسے مکمل طور پر غارت کر دیا اور یہودیوں کو فلسطین سے نکال کر چار وانگِ عالم میں بکھیر دیا۔

فلسطین سے نکل کر یہودی جس جس ملک میں گئے وہیں آباد ہوگئے اور وہیں کے باشندے بن گئے۔ فلسطین میں ان کی تعداد بمنزلہ صفر کے رہی۔ ان میں سے بعض البتہ فلسطین کے خواب ضرور دیکھتے رہے اور وقتاً فوقتاً قطرہ قطرہ، فرداً فرداً فلسطین میں واپس آتے گئے۔ ان کی مراجعت کی ایک حد تک وجہ "یادِ وطن" تھی اور ایک حد تک یہ مذہبی آرزو اور عقیدہ کہ فلسطین خدائے یہوہ نے ان کے لئے مقدر کر دیا ہے۔ "دشمن" کی فتوحات اور اپنی شکستیں "تقدیر" کے اس لکھے کو مٹا نہیں سکتیں۔ یہ آرزوئے

وطن، مذہبی عقیدہ سے مذہبی رسم میں بدل گئی۔ چنانچہ ہر سال کی ضیافت میں یہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں کہ "آئندہ سال یروشلم میں"۔

یہودی تاریخ ساز نہیں بلکہ تاریخ کی ساخت ہیں۔ انہوں نے تاریخ کو بنایا نہیں بلکہ وہ تاریخ سے بنے ہیں۔ جب صحراؤں کی خاک چھاننے کے بعد ارض مقدس و موعودہ میں داخل ہوتے ہیں تو تاریخ کے قابل ذکر ابواب ان کی آس پاس کی قوموں کے ہاتھوں لکھے جا چکے تھے۔ انہوں نے نہ کلچر کو ترقی دی، نہ تہذیب و تمدن میں ہی کچھ خاص اضافہ کیا۔ ان کی حکومت اور تشخص قومی کا دور مختصر اور ناقابل رشک تھا۔ جب بھی ان کے پاس کچھ دولت جمع ہو جاتی اور فراغت کے آثار نمایاں ہونے لگتے، کوئی نہ کوئی غارت گر آ پہنچتا اور ان کو تباہ و برباد کر کے چلا جاتا۔ بخت نصر کے ہاتھوں جب ان کی تباہی ہوئی ہے تو پھر تاریخ کا رہا سہا رشتہ بھی ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ شاہ فارس سائرس نے ہر چند انہیں فلسطین واپس آنے کی اجازت دے دی لیکن چونکہ اسارت کا زمانہ ساٹھ سال کا ہو چکا تھا، اس لئے کم تعداد میں یہودی واپس آئے اور جو آئے وہ بھی اصلی یہودی نہیں تھے۔ ان کا تشخص مٹ چکا تھا اور ذلت و مسکنت کی لعنت ان پر مسلط ہو چکی تھی۔

زمان و مکان کے پاس یہودیوں کے لئے ظلم و استبداد کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہر ملک اور زمانے میں وہ دیگر اقوام کا تختۂ مشق بنے رہے۔ جب عیسائیت کا دور دورہ شروع ہوا تو اس حقیقت کے باوجود کہ حضرت مسیح یہودی تھے اور ان کے اولین حواری بھی یہودی تھے، ان کو دشمنانِ مسیحیت سمجھ کر مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ عجیب و غریب حقیقت ہے کہ عیسائیت یہی یاد رکھ سکی کہ مسیح کو مصلوب کرنے کے

ذمہ دار یہودی تھے۔ وہ یہودہ اسکریوطی کو تو یاد رکھ سکی لیکن خود اپنے بانی حضرت مسیح، جان اور پال کو بھول گئی۔ عیسائی سلطنت میں یہودیوں کے لئے چنگی خانے بنائے گئے۔ معاش کی راہیں ان کے لئے مسدود کر دی گئیں اور ان کے خلاف نفرت و حقارت پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ ان کے لئے سود خواری کے علاوہ کوئی راہ معاش نہیں تھی۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انہیں طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچائی گئیں اور بے دردی اور سفاکی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ پوپ پئیس پنجم کے ایک حکم سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں پرانے کپڑے بیچنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ یہ کڑی سزا اس ایک جرم کی پاداش میں تھی کہ وہ یہودی تھے۔

انقلاب فرانس نے خیالات و نظریات میں جو رواداری اور کشادہ نگہی پیدا کی وہ یہودیوں کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ ۱۷۹۰ء یہودیانِ یورپ کے لئے ایک نئی صبح کا پیغام تھا۔ آئندہ ایک سو سال میں روس کے علاوہ ہر جگہ ان پر سے پابندیاں ہٹادی گئیں۔ اب وہ معزز شہری بن سکتے تھے۔ گاڑیوں میں سفر کر سکتے تھے۔ زمین کے مالک بن سکتے تھے اور دیگر آزاد شہریوں کی طرح آزادانہ کام کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا ملک ہو جہاں ان کے خلاف کسی قسم کی نفرت نہ پائی جاتی ہو۔ کم یا زیادہ نفرت ضرور پائی جاتی ہے۔ ان مراعات کا خاطر خواہ اثر ہوا اور یہودی جہاں کہیں آباد تھے، وہیں کے مستقل باشندے بن گئے۔ وہ کوئی دو ہزار سال سے غریب الدیار اور بے وطن مارے مارے پھر رہے تھے۔ فلسطین، جس میں شاید ہی کبھی وہ اطمینان سے رہ سکے ہوں، ان سے

چھن چکا تھا۔ وہ ان کی نگاہوں میں بدستور مقدس تھا اور اس احساس تقدس کا مظہر وہ PASSOVER کی سالانہ ضیافت تھی جہاں آئندہ سال یروشلم میں" کا لفظی ورد کیا جاتا تھا۔ اس رسم میں اس اُمید کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ یہود کسی نہ کسی دن، کسی نہ کسی طرح ہیکل سلیمان کی از سرِ نو تعمیر کریں گے۔ یہودیوں کی یہ مقدس آرزو مستقل خطرہ ہے کیونکہ ہیکل سلیمان کی جگہ مسجد عمرؓ استوار ہے۔ ایک نئی تعمیر دوسری کی تخریب ہے۔ عرب (مسلمان) کہ سلیمان کو بھی اپنا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں، سلیمان کے ہیکل کو اپنی مسجد سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہیکل کی مسجد میں "تبدیلی" نہ تخریب ہے نہ نئی تعمیر، بلکہ ان کے نزدیک یہ سلک مسلسل ہے۔ یہودیوں کے نزدیک تعمیرِ مسجد غصب ہے۔ وہ اسے برباد کر کے ہیکل کی تعمیر کے متمنی ہیں۔ یہ بنیادی فرق علت ہے اس نزاع خونیں کی جس کی زد میں فلسطین ہے۔

مسلمانوں کی آمد
— صلیبی جنگیں

حضرت عمرؓ خلیفۂ ثانی کے عہد میں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کوئی چار ہی سال بعد، ۶۳۶ء میں، مسلمانوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے لیکر ۱۹۱۷ تک کہ جنرل ایلن بی نے ترکوں سے اسے فتح کیا، سوائے اس عرصے کے کہ

صلیبیوں نے لاطینی حکومت کا قیام کیا۔ فلسطین پر ہمیشہ مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ دسویں صدی میں عربی قوت و شوکت ان کی قبائلی عصبیت لہٰذا خانہ جنگی کے ہاتھوں کمزور ہو چکی تھی ان کے مقابلے میں ترک اُبھر رہے تھے۔ گیارہویں صدی میں سلجوقی ترک میسوپوٹیمیا پر حملہ آور ہوئے اور خلیفۂ وقت کو اپنے قبضہ میں کر لیا، گو بظاہر اسے خلیفہ ہی رہنے دیا۔ انہوں نے ۱۰۷۱ تک ایشیا سے بازنطینی حکومت کا مکمل استیصال کر دیا۔ سلجوقیوں نے ۱۰۷۵ کے قریب یروشلم پر بھی قبضہ کر لیا اور تابوتِ مقدس تباہ کر دیا۔ اس غارت نے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ پوپ نے مقدس صلیبی جنگ کی تبلیغ شروع کر دی تاکہ "کافر" ترکوں سے پورا انتقام لیا جائے۔ ایک ناکام کوشش کے بعد ۱۰۹۹ میں پاپائیانِ یورپ نے یروشلم پر حملہ کیا اور ایک ماہ کے محاصرے کے بعد اسے فتح کر لیا۔ یروشلم کی گلیوں میں اس قدر کشت و خون ہوا کہ گھوڑوں کے ٹاپوؤں سے خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر سواروں پر پڑتے تھے۔ ۱۱۰۰ میں لاطینی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۱۶۹ میں غازی صلاح الدین ایوبی نے مسلمانوں کے منتشر قوتے کو مجتمع کیا اور عیسائیوں کے خلاف جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ ۱۱۸۷ میں مسلمانوں کا یروشلم پر قبضہ ہو گیا۔ مسیحیوں نے شکست کھا کر تیسری صلیبی جنگ کی طرح ڈالی مگر ناکام رہے۔ چوتھی صلیبی جنگ برائے نام تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایوبی کے بھرپور وار کے بعد صلیبی بالکل نہیں سنبھل سکے اور مسلمانوں کے مقابلے میں پھر کبھی نہ آ سکے۔ اس کے بعد تاتاریوں کی ہلاکت سامانی کا سیلاب آیا اور گذر گیا۔ ان کے بعد ترکانِ عثمانی اٹھے جو یورپ میں بھی داخل ہو گئے۔ تھریس، بلغاریہ، مقدونیہ اور سرویا تک کو فتح کر لیا۔ ۱۴۵۳ میں قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد خلافت کا اعلان کر دیا گیا جس کا الغا ۱۹۲۳ میں

مصطفےٰ کمال کے ہاتھوں ہوا۔ ۱۹۱۷ میں جنرل ایلن بی کی سرکردگی میں فلسطین انگریزی قبضے میں چلا گیا۔ تاریخ کے نشیب و فراز میں فلسطین اپنی جغرافیائی اہمیت کے پیشِ نظر فاتحین کی جنگ آزمائیوں کا میدان بنا رہا۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے فلسطین سے نکل جانے کے بعد یہودیوں کی آبادی فلسطین میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ کچھ یہودی جو بیچارگی کے عالم میں پیچھے رہ گئے تھے وہ اسی حال میں رہے تھے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں کہ یہ عرصہ مغربی قوائے استعمار کی خصوصی سرگرمی کا حامل ہے، بیرونی یہودیوں نے فلسطین میں قدرے دلچسپی لینی شروع کی۔ استعماریت کے پس منظر میں فلسطین کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت کے پیشِ نظر یہ ناگزیر تھا۔ تمام قوتیں اس اہم مرکز پر تسلط جمانا چاہتی تھیں۔ یہودیوں کی موجودگی سے عربوں کی اہمیت اور ان کے قبضے کو کم کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ کچھ یہودی خریدی ہوئی زمینوں پر آباد ہو گئے اور اس طرح "نئی آبادیوں" کی طرح ڈالی۔ لارڈ راس چائلڈ اور دیگر امیر ترین یہودیوں کی بدولت سرمایہ کی کوئی کمی نہیں تھی، بلکہ مسرفانہ خرچ کیا جا سکتا تھا۔ متواتر پروپیگنڈے اور چندوں سے بیرونی یہودیوں کو جو اطمینان سے اپنے اپنے ملکوں میں رہ رہے تھے اور مطلقاً ترکِ وطن کے لئے تیار نہ تھے، رعب اور لالچ سے مجبور کیا گیا کہ وہ فلسطین جائیں، زمینیں خریدیں اور نئی یہودی آبادیاں بسائیں۔ لارڈ راس چائلڈ اور دوسرے سرمایہ دار یہودیوں نے ان آبادیوں کے قیام و ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ اس عالمگیر یہودی جدوجہد کا چنداں خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں فلسطین میں یہودیوں کا تناسب آبادی بمشکل پانچ فیصد تھا جو پہلی عالمگیر جنگ کے آغاز تک سات فیصد سے زیادہ نہ ہو سکا۔ اختتام جنگ پر ۱۹۱۹ میں

یہ تناسب دس فیصد تھا۔ گویا سرمائے کے بے تحاشہ استعمال کے باوجود فلسطین اختتام جنگ اول تک مکمل عربی ملک تھا کیونکہ عرب آبادی نوے فیصد تھی۔

یہودی سرمائے اور پروپیگنڈے کو بین الاقوامی حالات نے کافی کمک پہنچائی۔ ۱۸۸۱ میں روس اور رومانیہ میں آباد یہودیوں پر مظالم کا بے پناہ ریلا آیا۔ یہودی چار و ناچار ان ممالک سے نکل پڑے۔ ان تارکینِ وطن کی حقیر سی تعداد عازمِ فلسطین بھی ہوئی۔ ان دنوں یورپ میں ایک انجمن محبانِ صیہون قائم ہوئی جس نے یہودی تارکینِ وطن کا رُخ سوئے فلسطین پھیرنے میں خاصی سرگرمی دکھائی۔ ۱۸۹۷ میں ایک آسٹروی صحافی تھیوڈور ہرزل نے صیہونی سوسائٹی قائم کی۔ ہرزل کا مقصد یہ تھا کہ یہودی قومی سٹیٹ میں اکٹھے ہو جائیں۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ایسی سٹیٹ فلسطین میں ہو۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ ۱۹۰۳ میں جب برطانوی حکومت نے یوگنڈا (افریقہ) کو بطورِ موزوں یہودی سلطنت (قومی وطن) کے پیش کیا تو ہرزل نے اسے قبول کر لیا۔ البتہ جب یہ پیشکش صیہونی کانگرس کے سامنے آئی تو اس نے نامنظور کر دی۔ اس وقت ہرزل کا انتقال ہو چکا تھا۔ صیہونیت کا صدر مقام برلن تھا۔

فلسطین پر یہودی استحقاق جتایا جاتا ہے۔ یہودی تاریخ کا جو سرسری جائزہ پیش کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ یہودی فلسطین پر صرف ایک قلیل مدت کے لئے حکمران رہے۔ اس زمانۂ اقتدار میں ہر چند انہوں نے مقامی باشندوں کا استیصال کرنے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں صرف مغلوب کر سکے فلسطین سے ختم نہ کر سکے، نہ اکھاڑ کر پھینک سکے۔ اس مختصر دورِ حکومت کے علاوہ ان کی ساری داستان ذلت و مسکنت اور تباہی و بربادی کی داستان ہے۔ وہ ایک دفعہ فلسطین سے بے دخل ہوئے تو

دو ہزار سال تک اس کی بازیافت کر سکنا تو درکنار اس میں معقول تعداد میں آباد بھی نہ ہو سکے۔ ان کا فلسطین پر حق چند سالہ حکومت سے ہے یا اس جذباتی وابستگی سے جو وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں فلسطین سے ہے۔ تاریخ و سیاست اول الذکر حق کو مطلقاً تسلیم نہیں کرتی۔ تاریخ ایک بھی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کوئی ملک کسی قوم کی تحویل میں اس لئے دے دیا گیا ہو کہ عہدِ ماضی میں وہ اس پر فرمانروا رہ چکی ہے سیاست کا کوئی اصول اس دلیلِ بے معنی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر یہ دلیل حق ملکیت کے حق میں دی جا سکتی ہے تو اس کا فائدہ عربوں کو ملنا چاہئے نہ کہ یہودیوں کو۔ فلسطینی (عرب) ہمیشہ فلسطین کے مالک رہے ہیں۔ وہ اس پر حکمران رہے ہوں، یا کسی اور قوم کے محکوم، وہ فلسطین کے مالک رہے، اسی سرزمین سے اٹھے اور اسی خاک میں مدفون ہوتے۔ ان کا جسمانی تعلق فلسطین سے کبھی منقطع نہیں ہوا۔ یہودیوں کو فلسطین بخش دینے کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے پہلے ان سے چھینا جائے جو اس کے جائز مالک ہی نہیں مسلسل مالک چلے آ رہے ہیں۔ ان کے ہاں انتقالِ ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں تک فلسطین سے یہودیوں کی جذباتی وابستگی اور "آئندہ سال یروشلم میں" کی سالانہ رسم کا تعلق ہے اس کی حقیقت رسم کہن کے رسمی اعادہ سے زیادہ نہیں جو یہودی فلسطین میں آ کر آباد ہوتے وہ وہ ہیں جنہیں ان کے آبائی وطن سے نکال دیا گیا ہے اور جنہیں صیہونی سوسائٹیوں نے مجبور کر کے فلسطین کی جانب بھیجا ہے کیا وجہ ہے کہ انگلستان اور امریکہ کے یہودی ترکِ وطن کر کے فلسطین میں نہیں آ جاتے؟ کیا وہ ان یہودیوں کے مقابلے میں، جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور جنہوں نے فلسطین میں پناہ لی، کم ایماندار یہودی ہیں؟ بات صاف ہے۔ چونکہ ان یہودیوں پر

ظلم و تعدی نہیں ہو رہا، اس لئے آئندہ سال یروشلم "میں" دہرانے کے باوجود اپنا ملک چھوڑ کر فلسطین جانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ خود راس چائلڈ اور دیگر سرمایہ دار یہودی فلسطین میں آکر آباد نہیں ہوتے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ فلسطین یہودیوں کا قلبی مطالبہ نہ تھا بلکہ خصوصی اغراض و مصالح کے تحت انہیں عرب مظلومین پر ٹھونسا گیا اور عربوں کو آبائی وطنوں سے نکالا گیا۔ یہودیوں کو یوں فلسطین پر ٹھونسنا عربوں کے خلاف جارحانہ کارروائی کے مترادف تھا۔

یہودی استحقاق کی دوسری وجہ مذہبی ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ فلسطین کے پیغمبر تھے اور یہودی اول الذکر کو اپنا قومی ہیرو تصور کرتے ہیں۔ یروشلم یہودیوں کا مذہبی مرکز ہے۔ یہ دلیل دیتے وقت اس بیّن حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ خود عربوں کے لئے فلسطین اتنا ہی تقدس کا حامل ہے جتنا یہودیوں کے لئے۔ وہ پیغمبر جنہیں یہودی اپنا سمجھتے تھے درحقیقت اسلام (لہٰذا مسلمانوں) کے پیغمبر ہیں۔ مسلمان ان پیغمبروں کا احترام ہی نہیں کرتے ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ فلسطین عربوں کا ہی نہیں مسلمانانِ عالم کا مذہبی مرکز رہ چکا ہے۔ اس خاک کا ذرّہ ذرّہ مقدّس ہے کہ وہ عروج و زوالِ اقوام کی الٰہی مشیّت کے پروگرام کا آئینہ بردار ہے اور ایمان و عمل کی بے نظیر تجربہ گاہ مسلمان کی تاریخ فلسطین کے بغیر نامکمل ہے۔ مسلمان نے اس رشتۂ عزیز کو ہمیشہ سینہ سے لگائے رکھا اور اسے جان سے عزیز تر رکھا، اب وہ اسے ہاتھ سے جانے دے سکتا ہے؟ یہودی اس رشتہ کو دو ہزار سال سے گم کر چکا ہے۔ وہ اسے ہاتھ میں لے سکتا ہے تو مسلمان کا سینہ چیر کر۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن مقامات پر مسلمان کا سینہ دو نیم ہوا ہے وہ تاریخ کے فیصلہ کن مقامات تھے۔ آج ہم پھر ایسے ہی فیصلہ کن

مقام پر ہیں۔

یہودی تاریخ کے سرسری جائزہ سے ان کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عربوں کی تاریخ دہرانے کا یہ موقع نہیں۔ یوں بھی عربی تاریخ ایسا گمشدہ باب نہیں جسے کوشش سے نمایاں کیا جائے۔ البتہ ربط قائم کرنے کے لئے مختصراً تازہ ابواب پر طائرانہ نگاہ ڈالئے۔ ترکوں کے دورِ حکومت میں عالم عرب پر عمومی طور پر جمود چھا گیا۔ ان میں بیداری کے آثار ۱۷۴۷ سے شروع ہوتے ہیں جب اس تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی جسے وہابی تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا آغاز عرب سے محمد ابن عبدالوہاب نے کیا جس کا مقصد اسلام کو ان آلائشوں سے پاک کرنا تھا جو دمشق اور بغداد میں اس کا لازمہ بن چکی تھیں۔ چونکہ ترکی حکومت عربوں کے لئے سیاسی غلامی کا باعث سمجھی یا سمجھائی جانے لگی تھی۔ اس لئے بتدریج ان میں آزادی خواہی کے جذبات بیدار ہوتے چلے گئے۔ وہابی جیسی اصلاحی تحریک نے بیداری کے آثار پیدا کئے تو سیاسی غلامی نے ان کا رُخ سیاست کی طرف ہی پھیر دیا۔ ۱۸۷۵ میں پانچ نوجوانوں نے مل کر بیروت میں ایک خفیہ سیاسی انجمن کی طرح ڈالی۔ ایسی خفیہ انجمنوں کی سرگرمیاں آہستہ آہستہ ترکی کے خلاف بھی ہوتی گئیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپی اقوام زندگی کی نئی تڑپ محسوس کر رہی تھیں۔ ان کے فکری ارتقاء میں مادیت کو دخل تھا اور کئی ایک فلسفی وحشیانہ قوت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ اقوامِ یورپ قومی تغلّب کے نشے میں بدمست ہو کر دنیا کے مختلف خطوں میں اپنے اپنے وقار کے لئے دوڑ دھوپ کر رہی تھیں۔ ۱۸۶۰ میں دمشق اور لبنان میں مسلم، عیسائی فسادات ہوئے جن میں عیسائیوں کو نقصان

اٹھانا پڑا۔ ان فسادات کو بہانہ بنا کر نام نہاد عیسائی سلطنتوں نے مشرقِ وسطیٰ کے امور میں دخیل ہونا شروع کر دیا۔ یورپی قوتے کی یہ مداخلت بتدریج بڑھتی گئی اور غیر یورپی ممالک ان کی باہمی رقابتوں کی آماجگاہ بن گئے۔ برطانیہ برصغیر پر قابض تھا۔ وہ انگلستان سے برصغیر تک کا راستہ محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ بحرِ روم اور بحرِ قلزم کے سواحل اس کے لئے مخصوص فوجی اہمیت رکھتے تھے۔ چنانچہ اس نے ۱۸۸۲ء میں مصر اور سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے الجزائر (۱۸۳۰) اور تیونس (۱۸۸۱) پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی نے بھی مشرقِ وسطیٰ پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالنا شروع کر دیں بیسویں صدی کے آغاز میں اٹلی نے بحرِ روم کو رومی جھیل بنانے کے قصد سے لیبیا کی رگِ جان میں اپنے خونی پنجے گاڑ دیئے۔ یہ سلسلہ جنگِ عالمگیر تک جاری رہا اور ممالکِ اسلامیہ استعمارِ فرنگ کا یا براہِ راست شکار ہو گئے یا بالواسطہ اس کے زیرِ اثر آ گئے۔

اندرونی خرابیوں اور بدنظمیوں اور مغربی قوتے کی ریشہ دوانیوں کے طفیل ترکی مردِ بیمار بن چکا تھا۔ ترکی اب تک خلافتِ اسلامیہ کا حامل تھا۔ اس کے دم سے بظاہر ممالکِ اسلامیہ ایک مرکز سے وابستہ تھے۔ یہ وابستگی جذباتی تھی۔ لیکن سیاست نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ عربوں کو ترکوں کے خلاف شکایات تھیں۔ ترک اندرونی اور بیرونی مصائب میں مبتلا تھے۔ اس پر مستزاد استعمار کا سیلاب اور قوتِ مغرب کی باہمی رقابت تھی۔ آتش فشاں پہاڑ بالآخر پھوٹا اور ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ترکی جنگ میں جرمنی اور آسٹریا کا حلیف بنا۔ خلیفۃ المسلمین ہونے کی حیثیت سے سلطان ترکی نے جہاد کا اعلان کیا۔ اس اعلان کا اثر شام (کلاں) یا ممالکِ عربیہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ برصغیر کے مسلمانوں تک پر تھا۔ برطانیہ کے لئے

یہ عظیم الشان خطرہ تھا جس کا سدِباب اشد ضروری تھا۔ کچنر کی سیاسی پیش بینی کو اس خطرے کا احساس جنگ سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ فروری ۱۹۱۴ میں وہ حسین ابن علی، شریف مکہ، سے اس کے دوسرے بیٹے عبداللہ کی معرفت مل چکا تھا۔

عرب اور برطانیہ

عرب خود متفرق اور غیر منظم تھے۔ حسین، شریفِ مکہ، اپنی خلافت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ ترکی کے خلاف انگریز سے سازش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن عربوں پر اسے یہ اعتماد نہیں تھا کہ وہ وحدتِ عربیہ پر جمع ہو جائیں گے۔ اس کا دوسرا بیٹا عبداللہ پُر امید تھا۔ وہ والد کی طرف سے کچنر، ٹارس اور بعد میں سر ہنری میکموہن سے مصروفِ گفتگو رہا۔ حسین کا تیسرا بیٹا فیصل ترکی کی معاونت کو ترجیح دیتا تھا تاکہ اس پر احسان کر کے معاہدۂ امن میں کچھ حاصل کیا جائے۔ حسین نے عبداللہ سے اتفاق کیا۔ بقول لارنس، حسین، فیصل سے متنفر بھی تھا۔ چنانچہ حسین نے انگریزوں سے مذاکرات جاری رکھے۔ اس کے ساتھ اس نے الفسطاط، الاحد جیسی انقلابی جماعتوں سے

بھی مراسم قائم کر لئے کیونکہ وہ ترکوں کے خلاف کہیں زیادہ باغیانہ سرگرمی دکھا رہی تھیں۔ جنگ جاری رہی۔ انگریز، ترکوں اور جرمنوں کے ہاتھوں پیہم شکستیں اٹھاتے جا رہے تھے۔ اب موقع تھا کہ عالم عرب کو ترکوں سے علیحدہ کیا جائے اور اپنے زیر اثر کیا جائے تاکہ انہیں ترکوں کے خلاف صف آرا کیا جا سکے۔ ایسے میں رسوائے عالم میکموہن مراسلت کا آغاز ہوا۔ میکموہن مصر میں برطانوی ہائی کمشنر تھا۔

حسین کا مطالبہ عرب آزادی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ عربی حکومت کی مغربی سرحد بحر قلزم اور بحر روم تک ہو۔ اس تحدید میں عرب عراق، شرقی اردن فلسطین اور شام شامل تھے۔ میکموہن نے اسے تسلیم کرتے ہوئے ان اضلاع کو نکال دیا جو دمشق، حمص، حماد اور حلب کے مغرب میں واقع تھے کیونکہ وہ علاقے خالصتہً عربی نہ تھے۔ اس "مغرب" کی بعد میں یہ توجیہہ کی گئی کہ اس سے فلسطین عربی سلطنت کی حدود سے خارج ہو گیا تھا۔ خود میکموہن نے ایک مرتبہ لندن ٹائمز میں لکھا کہ جن علاقوں سے متعلق وعدے کئے گئے تھے ان میں فلسطین شامل نہیں تھا۔ یہ قطعی غلط ہے اس لئے کہ میکموہن نے عربی سلطنت کی حد بحر روم تک تسلیم کر لی تھی۔ اس سے فلسطین خود بخود عربی حکومت میں آجاتا تھا۔ اگر بغرض استدلال اس شرط کو ساقط سمجھ لیا جائے تو نقشہ پر دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فلسطین دمشق کے مغرب میں نہیں بلکہ جنوب مغرب میں ہے۔ ایسی دور از کار اور احمقانہ توجیہیں برطانوی سیاست کا لازمہ ہیں۔ خود پاکستان کو ان کا کس قدر تلخ تجربہ ہو چکا ہے! فلسطین کو خارج کرنے کی ایک اور ایسی ہی لچر دلیل دی جاتی ہے میکموہن نے ایک شرط یہ لگائی تھی کہ عربوں کے مطالبات تسلیم کرنے میں برطانیہ فرانس کے مفاد کے منافی اقدام نہیں کرے گا۔ فلسطین میں فرانس کا مفاد کچھ بھی نہیں تھا۔ لہٰذا یہ

شرط فلسطین کے معاملہ میں ساقط العمل ہو جاتی ہے۔ یوں بھی فلسطین عربی ملک تھا۔ اس کی عرب آبادی نوے فیصد تھی۔ اس کے اخراج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فلسطین کو نکال کر عربی حکومت اور وحدتِ عربیہ کا مطالبہ بے معنی ہو جاتا تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ انگریز نے فلسطین کو فتح کیا تھا اس لئے اسے حق حاصل تھا کہ وہ اس کا کچھ بھی "استعمال" کرتا ــــ قومیں جائیدادیں نہیں ہوتیں کہ ان پر حق ملکیت تسلیم کیا جائے اور جیسے جی میں آئے ان کا استعمال کیا جائے۔ بیسویں صدی کی مہذب دنیا میں اس متروک و مردود نظریئے کو اساس گفتگو بھی نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ طرز استدلال غمازی کر رہا ہے کہ فرنگی ذہن سیاسی استبداد و ظلم سے اوپر نہیں اٹھ سکا۔ ایسے حضرات نے ابی سینیا پر اٹلی کا حق ملکیت تسلیم نہیں کیا، نہ انہوں نے چین کے مفتوحہ علاقے میں جاپان کا حق تسلیم کیا۔ اٹلی اور جاپان کے خلاف ان کی دی ہوئی دلیلیں خود ان کی تردید اور تغلیط کے لئے کافی ہیں۔

کرنل لارنس نے جنگ کے دوران ... عربی جذباتِ وطنیت کو ابھارنے میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ایلن بی نے اکتوبر ۱۹۱۷ میں جب فلسطین میں جارحانہ کارروائی شروع کی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریز ایک حلیف ملک میں لڑ رہے ہیں اور ترک دشمن ملک میں ہیں۔ عرب سپاہی ترک فوجوں سے بھاگ بھاگ کر آ رہے تھے اور ترکی عساکر کا سلسلہ رسد و رسائل درہم برہم ہو رہا تھا۔ ایلن بی کے الفاظ میں عربوں کی امداد "بے بہا" تھی۔ لائڈ جارج نے مؤتمر امن (۱۹۱۹) میں اعتراف کیا:

> شاہ فیصل نے اپنے تمام ذرائع ہمارے سپرد کر دیئے جن سے ہم کو مادی طور پر سب سے زیادہ مدد ان فتوحات میں ملی۔

جنگی امداد کے علاوہ عربوں نے انگریز کو کامیاب و فاتح بنانے کے لئے کیا کیا، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگائیے:-

ان (عربوں) کے گھر کی ایک ایک چیز خوراک خریدنے میں صرف ہوگئی، حتیٰ کہ ان کی چھتوں کی ٹائلیں بھی بکنا شروع ہوگئی تھیں ..... (یہ حالت جولائی ۱۹۱۷ کی ہے) پندرہ ماہ بعد جب بیروت فتح ہوا ہے تو حالات اور بگڑ چکے تھے۔ یہ کہنا شک و شبہ سے مبرا ہے کہ جنگ کے دوران ... تین لاکھ شامی فاقوں مر گئے۔ صحیح شمار ساڑھے تین لاکھ کا ہے۔ کوئی تین ہزار حیلوں میں جھونک دیئے گئے جن میں سے بیشتر نذر اجل ہوگئے۔ شام کی چالیس لاکھ آبادی میں سے پانچ لاکھ کے لگ بھگ جنگ میں کام آئے (THE ARAB AWAKENING)

عرب مسلمان تھے۔ انہوں نے ترکی دعوتِ جہاد کی کیوں پروا نہ کی؟ لارنس کے الفاظ میں:-

دورانِ جنگ ... عربوں کی ترکوں کے خلاف بغاوت اس لئے نہیں تھی کہ ترکوں کی حکومت خراب تھی، بلکہ اس لئے کہ عرب آزادی چاہتے تھے۔ انہوں نے جنگ کی آگ میں اپنی جانیں اس لئے نہیں جھونکی تھیں کہ وہ آقاؤں کی تبدیلی کریں اور برطانوی رعایا بن جائیں یا فرانسیسی شہری، بلکہ وہ اپنا صحیح مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔

(لارنس کے خطوط)

ترکوں کے دور نے عربوں میں بہت حد تک جذباتِ قومیت و آزادی پیدا

کر دیئے تھے۔ انگریز نے اس کا فائدہ اٹھایا اور عربوں کو آزاد عربستان کا سبز باغ دکھایا۔ عربوں کا اس دام میں آجانا عہدِ ماضی کا قدرتی نتیجہ تھا۔ ترکی اور جرمنی اتحاد کی شکست کی واحد صورت یہی تھی کہ مشرقِ وسطےٰ سے ان کو بے دخل کر دیا جاتا۔ اپنی اہمیت کے پیشِ نظر مشرقِ وسطےٰ جنگ کے نتیجہ کے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔ انگریز نے یہیں اپنے قدم جمانے کی کوشش کی۔ انگریز کی وسیع سلطنت کے لئے مشرقِ وسطےٰ خصوصیت سے اہم تھا۔ چنانچہ عربوں کو ترکوں سے علیٰحدہ کرنے کے لئے انگریز نے کمال فراخدلی سے ان سے وعدہ کئے۔ چونکہ مقصد عربوں کو ترکوں کے خلاف صف آرا کرنا تھا، اس لئے وعدوں کی معقولیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس مصیبت میں انگریز نے ہر اس چیز کا وعدہ کیا جو وہ کر سکتا تھا اور جس کا نتیجہ عربوں کو ترکوں سے علیٰحدہ کرنا ہو سکتا تھا۔

عربوں کی شرکتِ جنگ وطنی آزادی کی خاطر تھی اور انگریز نے اس کا حتمی وعدہ کر رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنے قول میں کس قدر مخلص تھا، اس کا اندازہ اس وقت کے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ میکموہن نے اگست ۱۹۱۵ میں حسین کو لکھا:

> لارڈ کچنر نے جو اعلان علی آفندی کی معرفت آپ تک پہنچایا ہے اور جس میں ہماری ممالکِ عربیہ اور ان کے باشندگان کی آزادی کی خواہش کا اظہار ہے، ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

مئی ۱۹۱۶ میں جب عرب یقینی طور پر انگریزوں کے حلیف بن چکے تھے، برطانیہ اور فرانس میں ایک خفیہ معاہدہ SYKES PICOT AGREEMENT طے ہوا۔ اس معاہدہ میں ہر چند برطانیہ (اور فرانس) کے اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ

وہ ایک آزاد عرب حکومت یا عربی وفاق کے موید ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے معاہد ممالک عربیہ کو حلقہ ہائے اثر (برطانوی اور فرانسیسی) میں تقسیم کرنے میں اتفاق کر لیا۔ اس معاہدہ کی رو سے فلسطین کو بین الاقوامی علاقہ قرار دے دیا گیا۔ ذرا غور کیجئے! معاہدہ عربی ممالک سے متعلق ہو رہا ہے اور عربوں سے انگریز کے حتمی مواعید موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود فرانس سے یک طرفہ معاہدہ کر لیا جاتا ہے جو اس معاہدہ کی صریح خلاف ورزی ہے جو عربوں سے کیا جا چکا ہے۔ اگر سائیکس پکٹ معاہدہ برطانیہ کے سابقہ مواعید کے مطابق تھا تو اسے حسین سے پوشیدہ کیوں رکھا گیا؟ کیا یہی بات شک کے لئے کافی نہیں تھی؟ استعمار فرنگ کی یہ بداخلاقی اور بددیانتی بین الاقوامی سیاست کا طرۂ امتیاز ہے اور بین الاقوامی مسائل کی، کہ ان میں سے اہم فلسطین ہے، علت العلل ہے۔ جب ۱۹۱۶ میں روس کی اشتراکی حکومت نے اس خفیہ معاہدے کو شائع کر دیا اور حسین نے فوراً میکموہن کو اس کے متعلق لکھا تو میکموہن نے اسے ترکی کی شر انگیز کوشش قرار دیتے ہوئے عربوں کی یوں تشفی کی کہ برطانیہ پہلے کی طرح عزم مصمم کئے ہوئے ہے کہ وہ وحدت و استقلال عربیہ کی تشکیل و تقویم کرے گا۔ انگریز کی اس منافقت کا انکشاف ہونے سے عربوں کے ایک حلقہ میں نہ صرف انگریز سے متعلق بلکہ خود حسین سے متعلق شکوک پیدا ہو گئے چنانچہ سات عرب زعماء نے برطانیہ کو ایک یادداشت بھیجی جس کے جواب میں وزارت خارجہ (برطانیہ) نے THE DECLARATION TO SEVEN شائع کیا۔ اس اعلان میں پھر اعادہ کیا گیا۔

جن عربی ممالک پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کیا ہے، ان کے متعلق ملک معظم

کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ان ممالک کی آئندہ حکومت متعلقہ باشندوں کی رضامندی سے تشکیل پذیر ہو۔ جو علاقے ابھی تک ترکوں کے قبضے میں ہیں، ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی خواہش ہے کہ ان علاقوں کے غلام باشندے خود مختاری اور آزادی حاصل کریں۔ ملک معظم کی حکومت اس مقصد کی تکمیل میں بدستور کوشاں رہے گی۔

۷ نومبر ۱۹۱۷ کو فلسطین، شام اور عراق کے کونے کونے میں ایک اعلان چسپاں کرایا گیا جس میں تحریر تھا:۔

مشرق وسطیٰ میں جرمنی نے جس جنگ کی طرح ڈالی ہے اس میں شریک ہوتے ہوئے برطانیہ اور فرانس کے پیش نظر مقصد ان لوگوں کی مکمل اور حتمی آزادی COMPLETE AND FINAL LIBERATION ہے جو اب تک ترکوں کے غلام چلے آئے ہیں۔ نیز ایسی قومی حکومتوں کی تشکیل جو مقامی باشندوں کے آزادانہ انتخاب و فیصلہ کا نتیجہ ہوں گی۔ برطانیہ اور فرانس کسی قسم کا بھی نظام حکومت اپنی طرف سے مسلط نہیں کریں گے بلکہ ایسی مؤثر امداد دیں گے جس سے وہ حکومتیں بخوبی چل سکیں۔

عربوں سے ایک مرتبہ نہیں، دو مرتبہ نہیں، بیسیوں مرتبہ وعدے ہوئے کہ ایک عرب ریاست یا عربی ریاستوں کا وفاق قائم کیا جائے گا۔ لیکن مؤتمر امن اور اس کے بعد عربوں کو تقسیم اور تقسیم در تقسیم کے سوا کچھ نہ ملا۔ سیریا کو شام، لبنان، فلسطین، عراق اور شرق اردن میں تقسیم کر دیا گیا۔ بقیہ شام کو آزادی نہیں دی گئی بلکہ مجبور کیا گیا کہ وہ انتداب قبول کرے۔ انتداب ایک بدعت تھی جو جمعیت اقوام نے پیدا کی۔ نہ اس کا عربوں کی

طرف سے مطالبہ ہو سکتا تھا، نہ انگریزوں کی طرف سے وعدہ۔ وعدہ خالص آزادی کا تھا جسے پہلو بدل بدل کر ٹالا گیا۔ عراق، حسین کے بیٹے، فیصل کو بخش دیا گیا۔ شرق اردن اس کے بیٹے عبداللہ کو۔ شام، فرانس کے انتداب میں دے دیا گیا اور فلسطین برطانیہ کے انتداب میں۔ کیا یہ فیصلے ان وعدوں کے مطابق تھے جو جنگ کے دوران ... عربوں سے کئے گئے تھے؟ کیا عربوں کا مطالبہ انتداب کا تھا؟ کیا یہ نئی حکومتیں مقامی باشندوں کی رضامندی سے متشکل ہوئی تھیں؟ عراق نے انتداب کی مخالفت کرتے ہوئے بامر مجبوری امریکی انتداب کو ترجیح دی۔ لیکن اسے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ یوں مقامی باشندوں کے ان مطالبات و خواہشات کو ٹھکرا دیا گیا جن کے احترام کے حتمی اور مکرر وعدے موجود تھے۔ لارنس لکھتا ہے:

> فرانس نے دیوانہ وار انتداب بدلنے کی کوشش کی۔ برطانیہ نے شرمناک سودا کر کے اس (فرانس) کی تائید کی تاکہ وہ میسوپوٹیمیا حاصل کر سکے۔ سائیکس پیکٹ کی رُو سے فرانس کو ساحل ملا اور عربوں کو حلب، حما، حمص، دمشق اور شرق اردن۔ انتداب کے صدقے میں اکثر و بیشتر حصے انگلستان اور فرانس نے ہتھیا لئے۔ س-پ۔ معاہدہ تحدید میں احمقانہ تھا مگر اس میں شام کا حق خود مختاری تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ (معاہدہ) آئندہ فیصلے سے دس ہزار گنا بہتر تھا۔

برطانیہ کو جنگ میں عربوں کی امداد کی ضرورت تھی، اس لئے اس نے ان سے رنگا رنگ وعدے کئے۔ برطانیہ کو اسی طرح یہودیوں کی بھی ضرورت تھی۔ اس نے عربوں کی طرح یہودیوں سے بھی مبالغہ آمیز اور غیر دیانتدارانہ وعدے کئے۔ پہلی عالمگیر جنگ

میں، کہ جس کے سیاسی پس منظر کے ایک پہلو کا ہم جائزہ لے رہے ہیں، جرمنی کی للچائی ہوئی نظریں مشرقِ وسطیٰ پر تھیں۔ انگریز نے جرمنی کا راستہ روکنے کیلئے یہودیوں کو بھی عربوں کی طرح سبز باغ دکھائے۔ ان متضاد وعدوں کی دوسری وجہ یہ تھی کہ امریکہ میں یہودیوں کا بے پناہ اثر تھا۔ وہ نہ محض امریکی پریس پر ہی چھائے ہوئے تھے بلکہ حکومت کی پالیسی ان کے ہاتھ میں تھی۔ برطانیہ، امریکہ کو اپنی طرف جنگ میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ امریکہ کے بغیر جنگ کے لئے نہ مطلوبہ سرمایہ فراہم ہو سکتا تھا نہ مطلوبہ بارود اور اسلحہ۔ امریکہ کو شریکِ جنگ کرنے کا ایک ذریعہ یہودی تھے۔ تیسری وجہ ڈاکٹر وائزمین، صدر ذائنسٹ ایسوسی ایشن نے مہیا کی۔ کیمیا داں وائزمین نے کیمیائی جنگ کے سلسلہ میں کوئی اہم انکشاف کیا جسے اس نے برطانیہ کے سپرد کر دیا۔ برطانیہ اس احسان کا بدلہ ضرور دینا چاہتا تھا اور وائزمین نے ذاتی انعام سے انکار کر دیا تھا۔ ان سب الجھنوں کا حل اعلان بالفور ہے جو ۲ نومبر ۱۹۱۷ کو شائع ہوا۔ اس میں مرقوم تھا:

> ملک معظم کی حکومت فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کو بنظرِ استحسان دیکھتی ہے اور امکانی کوشش کریگی کہ اس کا حصول آسان ہو جائے۔ یہ واضح رہے کہ ایسا کوئی اقدام نہیں کیا جائے گا جس کی زد فلسطین میں موجودہ غیر یہودی فرقوں کے سیاسی اور مذہبی حقوق پر پڑے یا یہودیوں کے اس سیاسی مرتبہ اور حقوق پر جو انہیں دیگر ممالک میں حاصل ہیں۔

اعلانِ بالفور ایک اہم سرکاری دستاویز ہے کہ جس کی رُو سے یہودیوں اور عربوں کی تقدیر کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اس عجیب و غریب دستاویز میں کہیں عربوں کا ذکر نہیں۔ فلسطین کی آبادی میں اختتامِ جنگ پر نوّے فیصدی عرب تھے اور صرف دس فی صدی

یہودی۔ لیکن اس بدقسمت ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت ذکر ہوتا ہے تو یہودیوں کا اور غیر یہودی فرقوں کا۔ گویا فلسطین میں بیشتر یہودی آباد تھے اور عرب اقلیت تھے ایسی اقلیت کہ اسے 'غیر یہودی فرقہ' کی غیر واضح اور مبہم اصطلاح سے ہی یاد کیا جاسکتا تھا۔ اس سارے اعلان میں 'عرب' کا لفظ تک نہیں۔ اور مدبرین و سیاست دان عربوں کی قسمت کا فیصلہ چکا رہے تھے! فلسطین کے اولین باشندے کون تھے؟ یہ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ یہ یقینی ہے کہ عرب (مسلمان) تیرہ سو سال سے اس ملک پر قابض و متمکن چلے آرہے تھے۔ یہودی دو ہزار سال سے اس ملک سے بے دخل تھے۔ اور اس دو ہزار سال میں ان کی زیادہ سے زیادہ آبادی دس فیصدی ہو سکی تھی۔ کیا دو ہزار سالہ تاریخ کا نوشتہ مٹایا جاسکتا ہے؟ کیا اتنے طویل سفر سے رجعت ممکن ہے؟ کیا انگریز یا کوئی طاقت تاریخ کے فیصلے کو الٹ سکتی ہے؟ کیا یہودیوں کو فلسطین اس لئے دیا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی دو ہزار سال پیشتر اس میں آباد تھے، حالانکہ اس کے بعد وہ بھیڑ بکریوں کی طرح وہاں سے بکھیر دیئے گئے اور پھر کبھی اتنی قوت بھی مجتمع نہ کر سکے کہ اس مقدس ملک پر تسلط جما سکیں؟ کیا اب انگریزوں کو محض اس لئے جرمنی کا ملک دیا جاسکتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کبھی جرمنی میں آباد تھے؟ یا انگلستان جرمنی کو بدیں وجہ بخشا جاسکتا ہے کہ اسے کبھی جرمن اسلاف نے فتح کیا تھا؟

یہود کا "قومی وطن"

بہر کیف اعلان بالفور نے 'قومی وطن' کا وعدہ کیا نہ کہ قومی حکومت کا۔ لیکن اس کے بعد کی ساری سیاست اسی نقطہ کے گرد گھوم رہی ہے کہ فلسطین یا اس کے کسی حصے میں یہودی حکومت قائم ہو جائے۔ 'قومی وطن' ایک بالکل نئی اصطلاح تھی، لہٰذا دیانت کا تقاضا تھا کہ اس کے معانی متعین کر دیئے جاتے تاکہ فریقین غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ اس سے پہلے کبھی بھی یہ مضحکہ خیز تصور پیش نہیں ہوا تھا کہ کسی ایک قوم کو کسی اور قوم کے ملک میں قومی وطن دے دیا جائے۔ اس اصطلاح کو قصداً مبہم رکھا گیا تاکہ جانبین کو اس حسین مغالطہ میں رکھا جائے کہ ان کے حقوق محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس کے معانی یہودیوں نے کیا سمجھے؟ اس کا اندازہ وائزمین کے ایک اعلان سے ہوتا ہے جس میں اس نے کہا کہ اب فلسطین ایسی ہی یہودی مملکت بن جائے گی جیسی کہ انگلستان انگریزوں کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بالفور نے زبانی اس مجذوب کی بڑ کی تائید بھی کی تھی۔ لیکن کیا آئین و قانون میں زبانی وعدے کوئی حقیقت رکھتے ہیں؟ بالخصوص ایسے وعدے جنہیں ضبطِ تحریر میں لانے سے خاص طور پہ گریز کیا جائے؟ وہ استغاثہ کی بنیاد نہیں بن سکتے، نہ فیصلہ کی اساس ہو سکتے ہیں۔

کیا ایسے زبانی وعدے کسی ملک پر اس کی منشاء و رضامندی کے خلاف مسلط کیے جا سکتے ہیں؟
شاہ فیصل نے اعلانِ مذکورہ کو غیر مشروط تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ اس سے متعلق معاہدہ پر دستخط کرتے ہوئے تحریر کیا تھا:

بشرطیکہ عرب اپنی آزادی حاصل کر لیں ..... لیکن اگر معمولی کمی بیشی بھی ہو گئی تو میں اس اعلان کے ایک لفظ کو بھی نہیں مانوں گا۔ اور یہ اعلان ساقط العمل، بیکار اور ناجائز ہو جائے گا۔ اور میں کسی طرح بھی کسی قسم کا جواب دہ نہیں رہوں گا۔

یہ غیر مبہم تحریر ہے اور اس کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ اعلان بالفور عربوں کی آزادی پر منتج ہو تو قابلِ عمل، ورنہ بے کار، ناجائز، ساقط العمل۔ اس اعلان نے یقیناً عربوں کو آزادی نہیں دلائی بلکہ انہیں اور پابند سلاسل کر دیا — لہٰذا عرب اس کا ایک لفظ بھی ماننے پر مکلف نہیں — لہٰذا اعلان ساقط العمل!
اب اسے اساسِ مذاکرات بنانا یعنی چہ!! اس کے باوجود معاہدۂ لوزان ۱۹۲۳ کی رُو سے فلسطین کو برطانوی انتداب میں دے دیا گیا جس کی اساس اعلانِ بالفور پر استوار تھی۔
یہ ظاہر ہے کہ جنگ کے دوران ان کی امداد و تائید حاصل کرنے کے لئے برطانیہ نے عربوں سے بھی وعدے کئے اور یہودیوں سے بھی۔ یعنی پہلے عربوں سے اور پھر یہودیوں سے۔ یہ وعدے یا تو ایک دوسرے کی ضد ہیں یا باہمی طور پر مطابق۔ اگر متضاد ہیں تو اخلاقاً اور قانوناً وہ وعدے قابلِ قبول و عمل ہیں جو پہلے کئے گئے۔ کیونکہ ایک قانونی ضمانت دے دینے کے بعد انگریز اس سے متضاد وعدہ کسی اور فریق سے نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا برطانیہ کے وہ وعدے جو یہودیوں سے کئے گئے اور

عربوں سے کیئے گئے وعدوں کی ضد ہیں، غیر قانونی اور قابلِ استرداد ہیں۔ اگر وہ وعدے ایک دوسرے کے مطابق ہیں تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ عرب اپنی آزاد حکومت قائم کر سکتے ہیں اور انگریزوں کا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ کسی عرب ملک میں کسی غیر عرب (یہودی) کی سلطنت قائم کریں یا اسے بزورِ شمشیر قائم کریں۔ اس سے فیصلۂ انتداب بھی غلط ہو جاتا ہے اور فیصلۂ تقسیم بھی۔ اگر تینوں فریقوں یعنی برطانیہ، عربوں اور یہودیوں میں سے کوئی ان وعدوں کا مفہوم کچھ اور لیتا ہے تو اس کے حل کی بہترین صورت یہ ہے یا تھی کہ تحریری دستاویزات کو کہ وہی وجہِ نزاع ہیں، بین الاقوامی عدالت میں برائے فیصلہ پیش کیا جاتا۔ برطانیہ نے ایسا کرنے کی بجائے معاملہ جمعیۃ اقوام کے سپرد کیا جس نے عربوں کی مرضی کے خلاف برطانوی وعدوں کو ٹھکراتے ہوئے فلسطین (اور بعض دیگر عربی ممالک) کو انتداب کی لعنت میں گرفتار کر دیا۔ جمعیۃ اقوام ایسا کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ معاہدۂ امن کی خبر پا کر عربوں نے جولائی 1919 میں دمشق میں ایک موتمر طلب کی۔ اس موتمر کی قراردادوں میں ہے کہ

> ہم جنوبی شام میں، جس کو فلسطین کہا جاتا ہے، یہودیوں کے اس مطالبہ کو رد کرتے ہیں کہ وہاں یہودی دولتِ مشترکہ قائم ہونی چاہیئے۔ ہم یہودیوں کے داخلۂ فلسطین ہی کے مخالف ہیں۔ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان کا ایسا حق ہے اور ہم ان کے مطالبات کو اپنی قومی، سیاسی اور معاشی زندگی کے منافی سمجھتے ہیں۔ ہمارے (موجودہ) یہودی شہری ہماری طرح ملکی حقوق و فرائض میں بدستور شریک رہیں گے۔

ممالکِ عربیہ میں عام جذباتِ نفرت پھیل گئے۔ ان کا خون، انکی قربانیاں، سب

اکارت گئی تھیں۔ عربی حمیت، قومی خودداری کی یہ تذلیل کب دیکھ سکتی تھی؟ انہوں نے بچے ذبح کرائے، جوان قربان کئے، مصیبتیں جھیلیں، ملک برباد کئے، اس امید پر کہ وہ آزادی سے ہمکنار ہو سکیں گے۔ لیکن اس سرفروشی اور ایثار پیشگی سے ملا تو کیا؟ ——— غلامی! لعنت و ذلت!!

فیصل نے تنگ آکر ایک کمیشن کا مطالبہ کیا جو جملہ امور کی تحقیقات کرے۔ برطانیہ اور فرانس کو اپنی شیطنت کاریوں اور ریشہ دوانیوں کا علم تھا۔ انہوں نے اس منصفانہ مطالبے کو تسلیم نہیں کیا۔ البتہ امریکہ نے کہ اس وقت تک غیر جانبدار تھا، اس کا خیر مقدم کیا۔ نتیجہ کنگ، کرین رپورٹ کی صورت میں نکلا۔ یہ رپورٹ اس لئے قابلِ ذکر ہے کہ غیر جانبدار اشخاص کی مرتب کردہ ہے۔ اس رپورٹ میں متشدد صیہونیوں کی مذمت کی گئی جو غیر محدود داخلہ فلسطین پر مصر تھے۔ انہوں نے اس پر بھی زور دیا کہ قومی وطن قومی حکومت نہیں۔ ایسا کرنا "غیر یہودی فرقوں" کے مدنی اور مذہبی حقوق کو پامال کئے بغیر ناممکن ہے۔ واضعین رپورٹ نے تسلیم کیا کہ وہ ابتداً یہودیوں کے حامی تھے۔ اس کے باوجود حقائق و واقعات کا مطالعہ کر کے انہوں نے مؤتمرِ امن کو مشورہ دیا:

یہودیوں کا داخلہ فلسطین یقینی طور پر محدود ہونا چاہئے اور فلسطین کو یہودی دولتِ مشترکہ بنانے کا ارادہ ترک کر دینا چاہئے۔

1919 کے بعد حالات کی رفتار بدل گئی کیونکہ ہمہ گیر خلافِ صیہونیت تحریک پھیل گئی جس سے یہودی کثیر تعداد میں سابقہ وطن ترک کر کے فلسطین میں آنا شروع ہو گئے۔ ان تارکینِ وطن یہودیوں کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا تو ان میں سے اکثر یقیناً فلسطین کا رُخ نہ کرتے۔ فلسطین یہودی بے وطنی اور غربت کا حل نہیں۔ لیکن صیہونی

سوسائیٹیوں نے اس مصیبت کا فائدہ اٹھایا اور اس سیلاب کو فلسطین کی جانب پھیر دیا۔ ۱۹۳۲ میں ہٹلر برسرِ اقتدار آیا۔ ہٹلر پہلی عالمگیر جنگ میں جرمنی کی شکست کا ذمہ دار بہت حد تک یہودی سازشوں کو قرار دیتا تھا۔ لہٰذا آئندہ تیاری سے پیشتر وہ اپنے ملک کو ان غداروں سے پاک کر دینا چاہتا تھا۔ ہٹلر کی فتوحات کے ساتھ ساتھ خلاف صیہونیت تحریک یورپ میں بھی پھیلتی گئی۔ چنانچہ ۱۹۳۹ میں فلسطین کی یہودی آبادی ۳۰ فی صدی تک پہنچ گئی۔ ۱۹۴۵ میں ان کی تعداد پچپن ہزار سے پانچ لاکھ اسی ہزار ہوگئی۔ عرب قدرتی طور پر متوحش ہوتے۔ انہیں ڈر پیدا ہوا کہ اگر فلسطین کے دروازے بدستور کھلے رہے تو یہودی ایک دن اکثریت میں ہو جائیں گے اور ان کا ملک یہودی ملک ہو جائے گا۔ یہودیوں نے سرمائے کے زور سے غریب عربوں کی زمینیں خریدنا شروع کر دی تھیں۔ وہ اپنی علیحدہ آبادیاں بسا رہے تھے۔ ان کی آمد سے عرب بے دخل اور اقتصادی طور پر یہودیوں کے زیرِ اثر ہوتے جا رہے تھے۔ یہودیوں کی پشت پر وہ یہودی سرمایہ دار تھے جو افسانوی دولت کے مالک تھے۔ صیہونیت ایک منظم تحریک تھی۔ اس کے مقابلے میں عرب غیر منظم اور مفلس تھے۔ لہٰذا ان کے خدشات قدرتی اور حقیقی تھے۔

کہا گیا کہ چونکہ یہودی مظلوم ہیں اور انہیں آبائی گھروں سے نکالا گیا ہے اس لئے انہیں فلسطین میں آباد ہونے دیا جائے۔ یہ دلیل دینے والے یہ نظر انداز کر گئے کہ اس طرح عرب جو خود سامی النسل ہیں وہ بھی نام نہاد "اینٹی سامی" تحریک کے علمبردار بن جائیں گے۔ ہٹلر نے یہودیوں پر جو مظالم کئے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود آریائی نسل سے تھا اور سامیوں کا دشمن تھا۔ یہودی مظلومین کے نام نہاد ہمدردوں اور بہی خواہوں نے جس انداز سے یہودیوں کو فلسطین پر ٹھونسا ہے اس

سے "سامی دشمنی" کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ عرب کبھی سامیوں (یہودیوں) کے دشمن نہیں تھے۔ وہ اب بھی نہیں۔ انہوں نے بارہا اعلان کیا ہے کہ عرب ممالک میں بسنے والے یہودیوں کو پورے شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ ان پر یہودی ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی۔ فلسطین میں موجود یہودیوں سے اب بھی وہ فراخدلانہ برادرانہ سلوک کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن جن یہودیوں نے عربوں کے وطن کو خون و آتش کی بازی گاہ بنایا ہے، جن کے ہاتھوں عربوں کے مال و دولت کو نقصان پہنچا، ان کی جانیں ضائع ہوئیں، انہیں عرب کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ ہمدردانِ یہود نے یہودیوں کو 'سامی دشمنی' کے یورپی حلقے سے نکال کر عربی حلقہ میں جھونک دیا ہے۔ یورپ میں جو آگ خاموش ہو گئی تھی، اسے محبانِ اسرائیل نے عرب میں روشن کر لیا ہے۔ اب یہودی اپنے ہاتھوں جلائی ہوئی اسی آگ میں جل رہے ہیں اور یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ یہ آگ یونہی روشن رہی تو اس میں کون کون اور کیا کیا جلے گا۔

انتدابِ فلسطین "اے کلاس" تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ فلسطین کی آزادی تسلیم کر لی گئی ہے لیکن جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا، اسے نگرانی میں رکھا جائے گا لیکن انگریز کی یہود نوازی عرب آزادی کی منزل کو دور سے دور تر کرتی گئی۔ ۱۹۲۷ء میں برطانیہ نے سیلف گورنمنٹ کی طرح ڈالنی چاہی۔ ایک نمائندہ اسمبلی کی تجویز ہوئی جو ہائی کمشنر کی مشاورتی مجلس ہوتی۔ یہود ہر چند اقلیت میں تھے تاہم ان کے نمائندے برطانوی پارلیمان میں بھی تھے اور برطانوی حکومت میں بھی۔ یہ حقیر سی کوشش بھی یہودی مخالفت کی نذر ہو گئی۔ انگریز نے ببانگِ دہل اسمبلی کے قیام کا اعلان کیا تھا لیکن اس نے اچانک اسے ترک کر دیا۔ عرب کب تک ضبط کرتے۔ معاملات دگرگوں ہوتے

جارہے تھے۔ ۱۹۲۶ میں فلسطین بھر میں احتجاجی مظاہرے شروع ہو گئے۔ برطانیہ نے تشدد سے اس آزادی کی رَو کو دبانا چاہا۔ عربوں کے ہیجان کی حقیقی وجوہات تھیں۔ اس لیے حکومت کا جبر و تشدد اسے کچل نہیں سکتا تھا۔ برطانیہ نے پہلو بدلا اور رائل کمیشن کا قیام کر دیا۔ کمیشن کی تحقیقات کا ماحصل یہ تھا کہ انتداب ناقابلِ عمل ہے۔ کمیشن نے یہ اضطراری حل پیش کیا کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے اور یہود اور عربوں کو علیحدہ علیحدہ حصّے عطا کر دیے جائیں۔

انتداب کا مقصد فلسطین کو آزادی کے لئے تیار کرنا تھا مگر برطانیہ نے فلسطین کو آزادی کے بجائے تقسیم کے لئے تیار کیا۔ یہ تقسیم کی پہلی تجویز تھی۔ فلسطین کی تقسیم! سابقہ پنجاب کے بمشکل چار اور سندھ کے کوئی دو اضلاع کے برابر ملک کی تقسیم!!! اور تقسیم کیوں؟ اس لئے کہ یہود کے لئے عرب ملک میں قومی وطن قائم ہو سکے! ابتداءً قومی وطن سے ہو گا اور انتہا قومی حکومت پر۔ آخر ان حرکاتِ مذبوحی سے حاصل؟ فلسطین کی مجموعی آبادی بیس لاکھ تھی اور اس کا رقبہ دس ہزار مربع میل۔ کوئی پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ غیر ذی زرع صحرائی ہے۔ اگر یہ سارا علاقہ آبادی کے قابل ہو سکے تو فلسطین کی آبادی دوگنی یعنی چالیس لاکھ ـــــ یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ ہو جائے گی۔ یہ سارے کا سارا قطعۂ زمین بھی یہودیوں کے لئے ناکافی ہے۔ دنیا بھر میں یہودی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے۔ اتنا حجم غیر یقیناً اس مختصر سے قطعۂ ارض میں نہیں سما سکتا۔ یعنی اگر سارے کا سارا فلسطین یوں یہودیوں کو دے دیا جائے کہ اس میں ایک عرب بھی باقی نہ رہے تو بھی یہودی اس میں نہیں سما سکتے۔ اور جب ایسا ہے کہ ان کی مشکل کا حل فلسطین نہیں ہو سکتا تو سارا زور صرف فلسطین پر صرف کرنے سے فائدہ؟ کیا یہودی ہمدردی کے

بہانے سے عربوں کو کچلا نہیں گیا؟ اور پھر اگر بالفرض یہودی سما بھی جائیں تو برطانیہ اور امریکہ ایسا کرنے یا کرانے والے کون؟ انہیں کس آئین یا کس قانون نے یہ حق دیا؟ اگر وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور بنی نوعِ انسان کے ہمدرد ہیں تو ان کا ادعائے ہمدردیٔ انسان اس وقت کس غار میں جا چھپا تھا جب مشرقی پنجاب، دہلی، مغربی یوپی اور کشمیر کے بیکس اور نہتے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا جا رہا تھا؟ تاریخ میں اس فقید المثال قتل عام کی زد اتنے انسانوں پر پڑی جو مجموعی طور پر یہودیوں کی دنیا بھر کی آبادی سے بھی زیادہ ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے نہایت تحمل اور خاموشی سے یہ ہمہ گیر ہلاکت و بربادی کا تماشہ دیکھا۔ خود اقوام متحدہ خاموش رہی اور ہے۔ کم و بیش ساٹھ لاکھ مہاجرین فلاکت زدہ، لٹے لٹائے پاکستان پہنچے۔ کسی کو یہ قیامت دیکھ کر خیال نہ آیا کہ ان مہاجرین کو اپنے ہاں جگہ دے دیں یا دنیا کے کسی اور گوشے میں ہی آباد کرا دیں۔ مسئلہ کی نوعیت دونوں حالتوں میں ایک ہے بلکہ مسلمانوں کا مسئلہ یہودیوں کی نسبت زیادہ وسیع اور اہم ہے۔

انگریز نے ان سب امور کو بالائے طاق رکھا اور یہودی محبت کے جنون میں رائل کمیشن نے جب پہلی مرتبہ تقسیم کا حل پیش کیا تو برطانیہ کے عزائم کا عربوں کو واضح طور پر اندازہ ہو گیا۔ جنگ کے دوران کے دلفریب الفاظ، جمعیۃ اقوام کے بلند بانگ کاغذی اصول، انتداب کا ادعائے آزادی سب منافقت پر مبنی تھے۔ حقیقت کچھ اور تھی۔ فلسطین میں ہمہ گیر مظاہرے شروع ہو گئے۔ اب کے یہ مظاہرے ان علاقوں میں خصوصیت سے زیادہ تھے جن کے متعلق تجویز تھی کہ انہیں یہودی علاقہ میں تبدیل کر دیا جائے۔ ۱۹۳۶ سے ۱۹۳۹ تک یعنی آغاز جنگ عالمگیر ثانی تک فلسطین

جنگ سے دوچار رہا۔ ایک طرف مخلص اور مفلس عرب تھا جس نے اپنا سب کچھ انگریز کی خاطر قربان کیا، اس فریب میں کہ وہ آزادی حاصل کر سکے گا۔ دوسری طرف انگریز تھا جس نے غلاموں کی آزادی خواہی کو عظیم الشان فریب دے کر انہیں مفت میں خرید لیا تھا۔ سابقہ دوست کا ہاتھ پرانے دوست سے حق دوستی کا تقاضا کر رہا تھا اور پرانا دوست سنگین، توپ، ہوائی جہاز سے اس کے جان و مال سے کھیل رہا تھا۔

اس جہاد حریت کے قائد مفتی اعظم حسینی تھے۔

ڈاکٹر ماڈرائڈن نے اپنی کتاب THE PROBLEM OF PALESTINE میں اس جہاد کا مختصر سا نقشہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہے:

(انگریز کی طرف سے) تشدد کا جواب تشدد سے دیا جا رہا ہے۔ عرب دیہات پر حملے کئے جاتے ہیں اور حکومت کی فوج انہیں برباد کر دیتی ہے۔ تعزیری کارروائیاں جاری ہیں۔ ان میں ہوائی بمباری، گھروں کو بارود سے اڑا دینا، دیہات کی تباہی، مال و دولت کی بربادی سب شامل ہیں۔ ملک میں حرکت محدود (اور دشوار) ہو گئی ہے اور کرفیو کا راج ہے۔ مشتبہ افراد کو قیدیوں کے کیمپوں میں بھیج دیا جاتا ہے اور بغیر مقدمہ چلائے محبوس رکھا جاتا ہے۔ دوسروں کو جزائر سیچل میں بغیر مقدمہ چلائے بھیجا جاتا ہے۔ کئی جیلوں میں لڑ رہے ہیں اور کئی موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔

یہ لرزہ خیز داستان ہے، ان کے لئے ناقابل برداشت جو برطانیہ، اس کے مدبرین اور اس کے سپاہیوں کے نام کو عزیز سمجھتے ہیں۔ میں

اس پر اس سے زیادہ رائے زنی نہیں کروں گی کہ آئرلینڈ کے زمانہ BLACKS اور TANS کے بدترین کوائف کو اس ملک میں دہرایا جا رہا ہے جسے سب عیسائی، یہودی اور مسلمان مقدس سمجھتے ہیں۔ جن لوگوں نے اس فلسطین کو دیکھا ہے جس کا میں ذکر کر رہی ہوں، ان کے لئے سرکاری تردیدی بیانات کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ انتہائی تشدد بیکار ثابت ہوا ہے۔ اور اس سے منافرت اور بڑھی ہے۔ بارہا عرب مردوں اور عورتوں نے مجھ سے کہا ہے: اگر برطانوی فوج چوبیس گھنٹے چھٹی لے لے تو فلسطین میں ایک بھی یہودی زندہ نہ رہے۔ یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو طبعاً نرم ہیں اور جو اسی سانس میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہودیوں کا مزید داخلہ بند کر دیا جائے تو کل امن ہو سکتا ہے۔

عربوں کے جوش و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ

ایک صاحب نے جن کا رنجدہ فریضہ یہ تھا کہ وہ ان قیدیوں سے ملیں جنہیں تشدد کے جرم میں موت کی سزا ملی ہے، مجھ سے بیان کیا کہ انہوں نے ایک 'مجرم' کو دیکھا کہ وہ دو زانو ہو کر اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے اُسے ملک اور مذہب کی خاطر جان دینے کی عزت عطا کی۔ ایک عرب (عیسائی) عورت نے مجھے بتایا کہ ایسے بیٹے کی ماں سے جب اس نے اظہار تعزیت کیا تو اس نے اس ہمدردی کو فخر و غرور سے رد کر دیا۔ ایک ماں جس کا بیٹا اللہ نے

یوں منتخب کیا ہو، قابلِ رحم نہیں، قابلِ عزت ہے۔ (ایضاً)

برطانیہ اپنی طاقت کے زعم میں اپنے جور و استبداد پر قائم رہا۔ بمبار ہوائی جہازوں کے سائے میں ۱۹۳۸ میں اس نے وڈ ہیڈ کمیشن بدیں مقصد فلسطین بھیجا کہ وہ تقسیم کے عملی پہلو سے متعلق رپورٹ پیش کرے۔ کمیشن کی علت تشکیل تقسیم پر رائے زنی نہیں تھی بلکہ تقسیم کی جزئیات طے کرنا تھی۔ کمیشن کی رپورٹ معلومات سے پُر ہے۔ اس نے سابقہ تجویز سے کہیں کہیں اختلاف کیا اور نئی تحدید پیش کی۔ رپورٹ کے ایک ایک صفحہ سے حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ یہ خاموش اعتراف نمایاں ہے کہ تقسیم ناقابلِ عمل ہے۔ چنانچہ کمیشن نے مجوزہ اجزائے فلسطین کی تحدید کے لئے فوجی قوت کی ضرورت پر زور دیا۔ گویا کمیشن نے یہ تسلیم کر لیا اور حکومتِ برطانیہ کو بتا دیا کہ تقسیم کے لئے تلوار ناگزیر ہے۔

۱۹۳۹ میں برطانوی حکومت نے عرب اور یہودی زعماء کو مذاکرات کے لئے لندن بُلایا۔ برطانیہ کا اعتماد عربوں کے دلوں سے اٹھ چکا تھا۔ ۱۹۱۴ سے ۱۹۳۹ تک کے پچیس سالوں کے انگریزی عربی تعلقات افسوسناک داستان کے حامل ہیں۔ اتنی بدعہدیوں اور جور و تعدی کے بعد عرب انگلستان کے خلوص نیت کے کیسے قائل ہو سکتے تھے۔ انہوں نے پوری جرأت سے کام لیا اور استقامت سے اپنے مطالبات پر اڑے رہے۔ ان کے جذبات کی گہرائی کا اندازہ یہاں سے لگ سکتا ہے کہ انہوں نے یہودیوں کے ساتھ ایک میز کے آس پاس بیٹھ کر مصروفِ گفتگو ہونے سے انکار کر دیا۔ برطانیہ نے مجبوراً جانبین سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی لیکن کوئی مصالحت کی صورت نہ بن سکی۔ برطانیہ نے بالآخر ۱۹۳۹ کا مشہور قرطاس ابیض

شائع کیا جس میں امن کا اپنا حل پیش کیا گیا تھا۔

اس قرطاس کی رُو سے یہودیوں کی آمد پر سے مزید پانچ سال تک کے لئے پابندی ہٹا دی گئی۔ البتہ یہ طے کیا گیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار سالانہ کی رفتار سے آسکیں گے۔ یعنی وہ کل پچھتر ہزار کی تعداد میں آئینگے۔ پانچ سال کے بعد مزید آمد عربوں کی رضامندی پر منحصر ہوگی۔ ہائی کمشنر کو یہ بھی ہدایات دی گئیں کہ وہ ایسے قوانین بنائیں جن سے یہودی عربوں کی مملوکہ زرعی زمین آسانی سے نہ خرید سکیں۔ بعض مخصوص علاقوں میں یہ خرید و فروخت حکومت فلسطین کی اجازت سے ہو سکے گی۔ دس سال کے بعد یعنی ۱۹۴۹ میں فلسطین آزاد ہو جائے گا۔

قرطاس کا مطلب صاف ہے۔ یعنی یہودیوں کی تعداد میں مزید پچھتر ہزار کا اضافہ ہوگا۔ فلسطین دس سال کے بعد آزاد عرب حکومت بن جائے گا۔ یہودی اقلیت میں رہیں گے اور عرب حکومت کے شہری بن کر۔ قرطاس ابیض نے تقسیم کو دفن کر دیا اور عربوں کے مطالبات کی صداقت اور بے پناہی کے سامنے برطانیہ کی قوت و شوکت نے ایک حد تک سپر ڈال دی۔ عربوں اور یہودیوں نے اس فیصلے کو تسلیم نہ کیا اور اسی حال میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوگئی۔ برطانیہ نے اپنی طرف سے زمینوں کی خرید و فروخت اور یہودیوں کے داخلے سے متعلق "پابندیوں" پر عملدرآمد شروع کر دیا۔

۱۹۴۵ میں جنگ کے خاتمے پر یورپی یہودیوں کی آمد کا دباؤ کافی بڑھ چکا تھا۔ صیہونیت فلسطین پر چھا جانے پر مصر تھی۔ قرطاس ابیض کی رُو سے فلسطین کے دروازے بند ہو چکے تھے اور وہ عربوں کی رضامندی ہی سے کھُل سکتے تھے۔ ادھر عرب جو پہلے بکھرے بکھرے تھے نہ محض فلسطین کے مسئلہ پر ہی بلکہ دیگر مشترک امور پر بھی متحد و

متفق ہو گئے۔ یہ اتحاد و اتفاق ۲۲ مارچ ۱۹۴۵ کو عرب لیگ کی باقاعدہ تشکیل میں ظاہر ہوا۔ عرب لیگ کی تشکیل کے بعد فلسطین کا معاملہ مقامی نہیں رہا بلکہ جملہ عالم عرب کا مشترک مسئلہ بن گیا۔ یہ مسئلہ یوں بھی فلسطین کے مقامی باشندوں کا کب تھا۔ فلسطین عربوں کا ہی نہیں مسلمانانِ عالم کا ہے اور تمام عالم اسلامی اس پر متفق ہے۔

انگلستان میں جنگ کے بعد حزب عمال برسر اقتدار آئی۔ ۱۹۴۵ کے انتخاباتِ عامہ سے جو نئی پارلیمان مرتب ہوئی اس میں سولہ یہودی ارکان تھے۔ خود عمال حکومت میں ایک وزیر اور دو نائب معتمد یہودی تھے۔ یہودیوں کو اپنے اس اثر و اقتدار کے باعث یقین تھا کہ وہ فلسطین کا فیصلہ حسبِ منشا کرا سکیں گے۔ لیکن جب وزیر خارجہ برطانیہ نے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر چکانا چاہا تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ قضیہ اتنا آسان نہیں جتنا یہودی شرکائے اقتدار سمجھ رہے تھے۔ ایک طرف یہودی دباؤ تھا اور دوسری طرف ممالک عربیہ کی لیگ کی متفقہ مخالفت۔ قبل اس کے کہ برطانیہ کوئی اقدام کرتا، خبر مشہور ہو گئی کہ ٹرومین صدر امریکہ برطانیہ سے اپیل کرنا چاہتا ہے کہ کم از کم اور ایک لاکھ یہودی فلسطین میں فی الفور لے لئے جائیں۔ ۱۹۳۹ سے ۱۹۴۴ تک پچھتر ہزار یہودی تو "جائز" طریقے سے آ گئے تھے، لیکن ان کی ناجائز آمد کبھی مکمل طور پر بند نہیں ہوئی تھی۔ اس پر مستزاد ایک لاکھ اور تھے جنہیں صدر امریکہ خواہی نخواہی فلسطین پر ٹھونسنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ ۱۹۴۸ میں ہونے والا صدارتی انتخاب تھا۔ امریکہ کے پریس اور حکومتی اداروں میں یہود کا بے پناہ اثر و رسوخ ہے۔ انتخابات کے موقع پر مخالف فریق یہودیوں کے

ووٹ حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی خوشامدیں کرتے ہیں۔ بقول تنخفے، اس موقع پر امریکہ پاگل ہو جاتا ہے۔ ٹرومین کو ڈر تھا کہ اس نے یہ اپیل نہ کی تو اس کی حریف ری پبلکن پارٹی ایسا کر دے گی۔ اس صورت میں یہودی ووٹ ٹرومین کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ محض اپنی انتخابی جیت کے لئے امریکہ کی دونوں پارٹیاں فلسطین کو جہنم میں جھونک دینے پر تیار تھیں۔

ٹرومین کی اپیل کے جواب میں برطانیہ نے امریکہ کو دعوت دی کہ اگر وہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرانا چاہتا ہے تو نتائج کی ذمہ داری لے اور یورپ میں یہودیوں کی حالت نیز فلسطین کی صورتِ حال کی پوری تحقیقات کرے۔ ٹرومین نے جھجکتے ہوئے یہ دعوت قبول کر لی۔ اس پر ایک مشترکہ انگلستانی، امریکی کمیشن مرتب ہوا جسے ہدایت دی گئی کہ وہ چار مہینوں کے اندر اندر رپورٹ پیش کر دے۔ کمیشن کی متفقہ سفارشات، ظاہر ہے کہ نہ عربوں کو مطمئن کر سکتی تھیں نہ یہودیوں کو۔ لیکن رپورٹ عربی مطالبات کی بے پناہی کا مزید اعتراف تھا۔ بہر حال کمیشن نے ٹرومین کا مطالبہ من وعن تسلیم کر لیا کہ ایک لاکھ یہودی فوراً فلسطین میں داخل ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ، امریکہ اور دیگر حکومتوں سے درخواست کی گئی کہ وہ بے وطن یہودیوں کے لئے یورپ میں کسی جگہ نئے گھر کی تلاش کریں اور اس ضمن میں فوری اقدام کریں۔ کمیشن نے نہ تو فلسطین کی آزادی کی سفارش کی، نہ عرب حکومت کی، نہ یہودی حکومت کی۔ بلکہ ایسی دو قومی حکومت کا مشورہ دیا جس میں عرب اور یہودی مساوی حقوقِ شہریت کے مالک ہوں۔ مزید رائے یہ تھی کہ فلسطین کو غیر معین عرصہ کے لئے انتداب سے نکال کر تولیت میں رکھ دینا چاہئے۔ زمینوں کی موجودہ پابندیوں کی تنسیخ کی رائے دیتے ہوئے کمیشن نے ایسی

تجاویز پیش کیں جن سے عرب کسانوں وغیرہ کے اس ضمن میں حقوق کی نگہداشت مقصود تھی۔ آخری سفارش یہ تھی کہ جانبین کے تشدد کو سختی سے دبایا جائے۔

ایک دفعہ پھر "ثابت" کر دینے کے علاوہ کہ تقسیم فلسطین ناقابلِ عمل اور ناممکن ہے معاملہ آگے نہ بڑھایا جاسکا۔

فلسطین اقوامِ متحدہ میں

انتداب عملاً برطانیہ کے لئے ایک مہنگا سودا ہو گیا تھا۔ انتدابی عرصے میں برطانیہ کو جان اور مال کا بھاری نقصان اُٹھانا پڑا۔ انگریز اس زیان سے تنگ آ گیا کیونکہ جنگ نے برطانیہ کے لئے ایسی گوناگوں مشکلات پیدا کر دی تھیں کہ فلسطین ان کی کمر ہمت توڑ رہا تھا۔ ناچار برطانیہ نے ۱۲ اپریل ۱۹۴۷ کو فلسطین کا معاملہ اقوامِ متحدہ کے روبرو پیش کر دیا۔

فلسطین اپنی مخصوص تاریخ کے اعتبار سے ایک قطعہ ارض نہیں رہا۔ جغرافیہ نے اسے کچھ ایسی اہمیت دی ہے کہ تاریخ ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رہی۔ سطورِ بالا سے ظاہر ہو گا کہ فلسطین کانٹوں کی سیج پر ہی رہا۔ اسی اہمیت نے اسے پھر بین الاقوامی استخوانِ نزاع بنا دیا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں ہر چند برطانیہ امریکہ اور روس متحد تھے۔ لیکن ان کے باہمی اختلافات کبھی رفع نہ ہو سکے۔ امن ہوا تو جنگ کے یہ

اتحادی دو فرقوں میں بٹ گئے۔ جنگ کا جو عظیم الشان بار برطانیہ پر پڑا، اس سے وہ اپنی عظمت و استقامت بہت حد تک ضائع کر چکا ہے اور اب وہ امریکہ کا دست نگر ہے۔ امریکہ ایک امیر و متمول ملک ہے اور اسے جنگ نے کم از کم نقصان پہنچایا۔ امریکہ آئندہ جنگی ممکنات کے خوف سے اس حیثیت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ روس بھی اپنے استحکام میں دیوانہ وار مصروف و منہمک ہے۔ مشرقی یورپ اور جنوبی یورپ کا بیشتر حصہ اس کا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کی اہمیت ظاہر ہے۔ جغرافیائی اہمیت پر مستزاد مشرقِ وسطیٰ کا تیل ہے۔ تیل عہدِ حاضر کی شدید ترین ضرورت ہے۔ ممالکِ عربیہ کا تیل ایک حد تک برطانیہ اور زیادہ حد تک امریکہ کے قبضہ میں ہے۔ روس کے اپنے تیل کے ذخائر کافی ہیں۔ لیکن وہ تیل کی دوڑ میں پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ ایران میں اس کی دلچسپی اسی ذہنیت کی آئینہ دار ہے۔ ترکی اور ممالکِ عربیہ میں بھی اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ امریکہ کی اپنی تیل کی پیداوار کافی ہے۔ لیکن اس کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ ذخائر کے جلدی ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کا تیل مقابلۃً نو انکشاف ہے۔ وہ کمیت اور کیفیت دونوں میں زیادہ ہے۔ چنانچہ اس تیل نے بین الاقوامی مسابقت پیدا کر دی ہے۔ تیل اور سیاست ایک ہو گئے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک اپنی پسماندگی کے طفیل چونکہ خود تیل کی پیداوار سے قاصر رہے اس لئے یہ نعمتِ عظمیٰ ان کے لئے وبالِ جان بن گئی ہے۔ روس اور امریکہ کی انتہائی خواہش اور کوشش ہے کہ وہ ان علاقوں پر اپنا تسلط قائم رکھیں۔ فلسطین کی اہمیت پھر بڑھ گئی ہے۔ کرکوک (عراق) سے تیل کی نالی (پائپ لائن) حیفہ (فلسطین) میں منتہی ہوتی ہے۔ حیفہ سے آگے تیل بذریعہ بحری جہاز لے جایا جاتا ہے۔ یہ لائن چھ سو

بیس میل لمبی ہے۔ اس سے اس علاقہ کی سیاسی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔
فلسطین کا انتداب اور دیگر متبادل تجاویز اسی سیاسی تسلط کی غماز رہیں۔

بہر کیف فلسطین کا معاملہ اقوام متحدہ کے روبرو پیش ہو گیا۔ اقوام متحدہ نے ایک خصوصی کمیٹی گیارہ ارکان پر مشتمل متعین کی جو فلسطین میں جا کر حالات و کوائف کا مطالعہ کرے اور اپنی سفارشات پیش کرے۔ کمیٹی مذکورہ نے ڈھائی ماہ کے بعد دو رپورٹیں پیش کیں۔ ایک اکثریت کی جس پر سات ارکان کے دستخط تھے، اور دوسری اقلیت کی جس پر تین ارکان کے دستخط تھے (ایک رکن غیر جانب دار رہا) اکثریت کی رپورٹ نے تقسیم کی تجویز پیش کی اور اقلیت نے ایسے وفاق کی جس کے اجزا عربی اور یہودی ریاستیں ہوں۔ عربوں نے ان میں سے کسی تجویز کو بھی قبول نہ کیا لیکن یہودیوں نے اکثریت کی رپورٹ کو منظور کر لیا۔ اقلیت کی رپورٹ کو یوں بھی اقوام متحدہ کے حلقوں میں کوئی اہمیت نہ دی گئی اور اقوام دو صفوں میں بٹ گئیں۔ ایک تقسیم کے حق میں اور دوسری تقسیم کے خلاف یعنی عربی وحدانی حکومت کے حق میں۔ اس پر فلسطین کمیٹی کی دو سب کمیٹیاں بنا دی گئیں جو متعلقہ تجاویز پر پوری طرح غور و خوض کریں۔ اور اپنی سفارشات پیش کریں۔ کمیٹی نمبر (۱) ان ارکان پر مشتمل تھی جو تقسیم کے حامی تھے۔ دوسری سب کمیٹی وحدانی حکومت کے حامیوں پر مشتمل تھی (اس میں چھ عرب ریاستیں اور افغانستان اور پاکستان تھے) پہلی سب کمیٹی کی صدارت مندوب پولینڈ کے سپرد تھی اور دوسری کی مندوب پاکستان چودھری ظفر اللہ خان کے سپرد۔

سب کمیٹی ۲ نے اپنی مدلل و معقول رپورٹ میں اس امر پر خصوصیت سے زور دیا کہ اقوام متحدہ تقسیم فلسطین کی مجاز نہیں۔ یوں تو جمعیتہ اقوام کو بھی یہ حق حاصل

نہ تھا کہ وہ فلسطین کو برطانیہ کے زیرِ انتداب کر دے، لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ مجلس عرصہ سے ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے حقوق و اختیارات کسی دوسری مجلس کے نام منتقل نہیں کئے تھے۔ اقوام متحدہ بالکل نیا ادارہ تھا۔ اسے فلسطین کے مستقبل سے متعلق کسی قسم کا فیصلہ کرنے کا حق و اختیار نہیں تھا، چہ جائیکہ وہ تقسیم کا فیصلہ صادر کرتا اور پھر اسے خواہی نخواہی مسلط کرتا۔ اس کے علاوہ جب انتدابی حکومت نے اعلان کر دیا کہ انتداب ختم کر دیا جائے گا تو فلسطین کو لامحالہ آزاد ہونا چاہئے تھا۔ برطانیہ نے اپنی روش یہ بنالی تھی کہ فلسطین اقوام متحدہ کے سپرد ہے۔ وہ جیسا چاہیں فیصلہ کریں، برطانیہ ان کے فیصلہ کا پابند ہو گا لیکن خود کسی قسم کی رائے یا مشورہ نہیں دیگا۔ وہ نہ تقسیم کے حق میں ہے نہ تقسیم کے خلاف۔ وہ اس فیصلہ کی تائید کرے گا جسے عرب اور یہود دونوں تسلیم کریں گے۔ برطانیہ نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو انتداب ختم کر دے گا اور فلسطین خالی کر دے گا۔ اختتام انتداب تک وہ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرے گا اور امن و امان کا تنہا محافظ ہو گا۔ اس کی فوجیں یکم اگست تک فلسطین سے نکل آئیں گی۔ ۱۵ مئی کے بعد وہ فلسطین کے لئے ذمہ دار نہیں ہو گا یعنی وہ یوں فلسطین کے طے شدہ حصوں پر قبضہ کرنے کے لئے

لہ پولینڈ کے مندوب یعنی سب کمیٹی ۱ کے صدر نے سب کمیٹی ۲ کے صدر سر ظفر اللہ خاں کے سامنے اعتراف کیا کہ آپ کی رپورٹ ہماری رپورٹ سے بدرجہا بہتر ہے۔ بقول ظفر اللہ خان اس سے اس کا مقصد سفارشات کی تائید نہیں تھا بلکہ معلومات و انداز استدلال کی تعریف تھی۔

یہودیوں کا راستہ بالکل ہموار کر دے گا

سب کمیٹی نے منشور اقوام متحدہ کے پہلے ضابطہ کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی جس میں مذکور ہے کہ اقوام متحدہ کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ اقوام عالم کو حق خود اختیاری میسّر آئے اور وہ اپنی حکومت اپنی رضامندی سے طے کریں۔ اس کے مطابق فلسطین کا فیصلہ اہل فلسطین کے سپرد ہونا چاہئے تھا نہ کہ اقوام متحدہ کے سپرد۔ یہودیوں سے متعلق کمیٹی مذکور نے بتایا کہ چونکہ فلسطین اب تک تین لاکھ یورپی یہودیوں کو پناہ دے چکا ہے اس لئے اس کے رقبے، ذرائع اور دیگر عناصر کے پیش نظر اس داخلہ کو بند کر دینا چاہئے اور یہودی مسئلہ کو بین الاقوامی خطوط پر طے کرنا چاہئے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل مشورے دیئے گئے۔

۱۔ جن یہودیوں کو اپنے گھروں سے زبردستی نکال دیا گیا ہے (اب چونکہ یورپ میں ان پر وہ ظلم و ستم نہیں ہو رہا، اس لئے) ان میں سے جتنے بھی ممکن ہوں اپنے گھروں میں واپس کر دیئے جائیں۔

۲۔ جو بآسانی اپنے گھروں میں واپس نہیں بھیجے جا سکتے ان کو ارکان اقوام متحدہ میں ان کی حکومتوں کی آبادی، رقبہ، ذرائع اور گنجائش کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔

۳۔ ایک ایسی کمیٹی مرتب کی جائے جو ہر ملک میں یہودیوں کے بسانے کی تعداد وغیرہ مقرر کرے۔

فلسطین کی آئندہ حکومت وحدانی طرز کی تجویز کی گئی جس میں تمام اقلیتیں شریک ہوں اور ان کے لئے مناسب تحفظات ہوں۔

یہ سفارشات مسئلہ زیر نظر کا صحیح حل تھیں۔ لیکن حل کی صحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اقوام متحدہ کے پیش نظر تو برطانیہ اور امریکہ کے سیاسی مصالح تھے جن

کے پیشِ نظر منصفانہ حل خارج از بحث تھا۔

کمیٹی نے تقسیم کے حق میں سفارش کی۔ رسمی مراحل کے بعد معاملہ ۲۶ نومبر ۴۷ء کو جنرل اسمبلی میں مباحثہ کے لئے پیش ہوا۔ تقسیم کا فیصلہ کیسے ہوا؟ یہ دلچسپ داستان ہے۔ مختصراً چوہدری ظفر اللہ خاں کے الفاظ میں:

۲۷ نومبر امریکہ کا تہوار ہوتا ہے۔ جسے یومِ تشکر کہا جاتا ہے اس لئے ہر رکن چاہتے کہ صدر تک کی خواہش تھی کہ نشست ۲۶ (بدھ) کی نیم شب تک ختم کر دی جائے۔ اسی اعتبار سے جانبین نے اس دن اپنی ساری قوتیں مرکوز کر لیں۔ تقسیم کے خلاف ۱۶ ووٹ جمع ہو گئے تھے۔ چونکہ ایسے معاملوں کے لئے دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے تقسیم کے حق میں ۳۲ ووٹ درکار تھے۔ یہ قریباً ناممکن سا نظر آتا تھا۔ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ ہم نے میدان مار لیا ہے اور تقسیم دفن ہو گئی ہے۔ اس اثنا میں افواہ مشہور ہو گئی کہ سیشن ملتوی ہو جائے گا اور ۲۸ تاریخ یعنے جمعہ کو منعقد ہو گا اور اسی دن ووٹ بھی لئے جائیں گے۔ صدر سے بات کرنے پر معلوم ہوا کہ ایسا ہی ہو گا۔ اسے بتایا گیا کہ دو دن کے وقفہ سے ہمارے ووٹ ضائع ہو جائیں گے لیکن کسی نامعلوم شخص نے التوا کے لئے کہا اور بالآخر سیشن ملتوی کر دیا گیا۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ گذشتہ سال یومِ تشکر کو اسمبلی کا سیشن منعقد ہوا تھا۔ لیکن اب یہ بہانہ کر دیا گیا کہ اس دن کو چونکہ امریکہ کی تعطیل ہوتی ہے اس لئے سیشن منعقد نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقفے میں نیویارک کے اخبارات میں خبر آئی کہ یہودی

لیڈر ٹرومین سے ملے۔ انہوں نے یہ دھمکی دی کہ اگر تقسیم ناکام ہوگئی تو بحالی یورپ کا بل ناکام کر دیا جائے گا۔ امریکہ کا سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ٹیلیفون اور تار کے ذریعہ کئی تقسیم کے خلاف مندوبین کی حکومتوں سے مصروفِ گفتگو ہوا اور انہیں اپنی ہدایات بدل دینے پر مجبور کیا۔ اس پر ہمارے ووٹ ۱۳ رہ گئے۔ ایسے مندوبین نے ہم سے معذرت کرتے ہوئے اس مجبوری کا اظہار کیا کہ ان کی حکومتوں نے حکم دے دیا ہے کہ ووٹ تقسیم کے حق میں دیئے جائیں۔ مثلاً ہٹی (جنوبی امریکہ) کے نمائندے کی آنکھوں میں آنسو تھے جب اس نے کہا کہ ہم نے اعلان کر رکھا تھا کہ ہم تقسیم کے خلاف ووٹ دیں گے لیکن ہمیں اس کے حق میں رائے دینے کی ہدایت آگئی ہے۔

روز ویلیٹ نے، کہ آنجہانی صدر روز ویلیٹ کے پوتے ہیں، "مڈل ایسٹ جرنل" کی اشاعت جنوری ۱۹۴۸ میں اقوام متحدہ میں مسئلہ تقسیم کے فیصلے میں صیہونی دباؤ کا یوں ذکر کیا:

ارکانِ اقوام متحدہ پر اثر ڈالنے کے لئے (تاکہ وہ جنرل اسمبلی میں تقسیم کے حق میں ووٹ دیں) ٹیلیفونوں، تاروں، خطوں، ملاقاتوں اور سیاسی اور اقتصادی دباؤ کا طوفان امڈا چلا آ رہا تھا۔ یہودیوں نے ان اقوام کو جو تقسیم کے خلاف رائے دینا چاہتی ہیں، تقسیم کے حق میں رائے دینے پر مجبور کر دیا۔ یہ سب کچھ اعادہ تھا اس کا جو کچھ نیویارک سٹیٹ کے انتخابات میں ہو چکا تھا۔

یہ کیفیت تھی اس دولتِ عظمیٰ کی جس کے سپرد دوسری عالمگیر جنگ نے اقوامِ عالم کی قیادت کردی تھی۔ اور یہ ہے منظر اس ادارۂ اقوامِ متحدہ کا جو اس لئے معرضِ تشکیل میں آیا کہ کرۂ ارض سے جنگ کو بدر کردیا جائے اور اقدارِ انسانیہ کو مستقل حیثیت دے کر امن و امان کو عام اور پائندہ کیا جائے۔ عراقی نمائندے کے الفاظ میں صدر ٹرومین نے ہی فلسطین کو آگ لگائی ہے اور وہی اسے بجھا سکتا ہے۔ یہ بین الاقوامی ریشہ دوانیاں سیاستِ دولِ عظمیٰ کا طرۂ امتیاز ہیں اور انہی نے فلسطین کو عقدۂ لاینحل بنا رکھا ہے۔

ان حالات میں ۲۹ نومبر کو جنرل اسمبلی نے تقسیم کا فیصلہ صادر کردیا۔ ۵۷ ووٹوں میں سے ۳۳ تقسیم کے حق میں تھے۔ ۱۳ مخالف اور ۱۰ ارکان غیر حاضر رہے۔ رائے شماری کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ امریکہ باوجود ساری ریشہ دوانیوں کے دو تہائی ووٹ حاصل نہیں کرسکا۔ جو ارکان غیر حاضر تھے وہ تقسیم کے خلاف تھے۔ گویا کہا جاسکتا ہے کہ ۳۳ کے مقابلہ میں ۲۳ ووٹ تھے۔ یہ کثرتِ رائے تو ہے دو تہائی ووٹ نہیں۔ بہرکیف یہودی ووٹوں کی خاطر تقسیم کا فیصلہ صادر کرادیا گیا۔ قبل اس کے کہ امریکہ کی مشکلات کا ذکر کیا جائے تقسیم کے مالہ و ماعلیہ پر ایک طائرانہ نگاہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔

اس فیصلے کے مطابق فلسطین عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کردیا گیا۔ یروشلم کو بین الاقوامی شہر قرار دیا گیا۔ سارے ملک کو ایک مشترکہ اقتصادی بورڈ کے ماتحت کردیا گیا جس کے ارکان میں سے تین عرب، تین یہودی اور تین اقوامِ متحدہ کی اقتصادی اور معاشرتی کونسل کے نمائندے تھے۔ ہرچند یہ فیصلہ تقسیم کا تھا لیکن مشترکہ اقتصادی

بورڈ رکھ کر ایک مرتبہ پھر عملی اعتراف کیا گیا کہ اس ملک کی تقسیم ناقابلِ عمل ہے۔

یہی سلطنت تین حصوں پر مشتمل تھی۔ شمال میں مشرقی گیلیلی جس کی سرحدیں شام اور لبنان سے ملتی ہیں۔ وسط میں تل ابیب کی بندرگاہ اور ساحلی میدان، جنوب میں نجف۔ پہلی تجویز کے مطابق جافا کی بندرگاہ یہودی سلطنت میں شامل تھی۔ اس کے مطابق یہودی حصہ ملک میں پانچ لاکھ نو ہزار سات سو اسی عرب تھے اور چار لاکھ ننانوے ہزار بیس (۴۹۹۰۲۰) یہودی۔ گویا یہودی حصے میں عربوں کی اکثریت تھی۔ اس غیر معقول، غیر منصفانہ تقسیم کے لئے وجہِ جواز یہ پیش کی گئی کہ یہودی بیرونی یہود کی آمد سے اپنی آبادی جلدی بڑھالیں گے اور پھر وہ اکثریت میں ہوجائیں گے۔ جافا نکال دینے کے بعد یہودی علاقہ میں چار لاکھ اٹھانوے ہزار یہودی اور چار لاکھ پینتیس ہزار عرب رہ گئے۔ فلسطین کی کل آبادی بیس لاکھ تھی جس میں تیرہ لاکھ عرب تھے اور چھ لاکھ پچاس ہزار یہودی۔ تقسیم کے حامی یہ دلیل دیتے تھے کہ یہودی آبادی کو عربوں کے ماتحت اقلیت بنے رہنے پر مجبور کرنا ناانصافی اور ظلم ہے۔ لیکن یہ دلیل دینے والے عربوں کو بالکل نظرانداز کر رہے تھے۔ اگر یہودیوں کو اقلیت بنانا ظلم تھا تو عربوں کو اقلیت بنادینا کہاں کا انصاف تھا؟ یہودی، کل آبادی کا ۳۳ فیصد تھے۔ اس کے برعکس یہودی علاقے میں عرب ۴۶ فیصد تھے۔ گویا ۳۳ فیصدی کو ۶۷ فیصد کی حکومت کے تحت اقلیت میں رکھنا تو ظلم تھا لیکن ۴۶ فی صد کو ۵۴ فیصدی کے تحت اقلیت بنا دینا ظلم نہیں تھا، عین انصاف تھا۔ مجموعی آبادی کو چھوڑ کر مختلف اجزاء کی علیحدہ آبادی لی جائے تو معاملہ اور مضحکہ انگیز ہوجاتا ہے۔ گیلیلی میں چھیاسی ہزار

عربوں کے مقابلے میں اٹھائیس ہزار یہودی تھے۔ نجف کی ایک لاکھ دو ہزار کی آبادی میں صرف دو ہزار (پھر سنیئے، صرف دو ہزار) یہودی تھے۔ وسطی علاقے میں ساٹھ فیصد یہودی اور ۴۰ فیصد عرب۔ اگر فلسطین کے انتظامی حصوں کو علیحدہ علیحدہ لیا جائے تو یہودیوں کی حیثیت اور کم ہو جاتی ہے۔ فلسطین کے ۱۴ یا ۱۶ انتظامی حصوں میں سے صرف ایک یعنی حیفہ میں یہودیوں کی اکثریت تھی۔ باقی ہر جگہ وہ اقلیت میں تھے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ان کی حکومت کہاں قائم ہو سکتی تھی؟ آبادی کے علاوہ زمین کی ملکیت میں بھی عرب بڑھے ہوئے تھے۔ یہودی علاقے میں زمین کی نجی ملکیتوں میں عربوں کا ۶۰ فی صد حصّہ تھا اور یہودیوں کا ۴۰ فیصد۔ اس کے باوجود تقسیم روا رکھی گئی اور یہودیوں کو جو علاقے بخشے گئے وہ زرخیز میدان تھے جنہیں مزید ترقی دی جا سکتی تھی۔ لیکن عربوں کے حصّے میں پہاڑی علاقے آئے جو ناقابلِ ترقی تھے۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ عربوں کو اقتصادی بورڈ کا محتاج بنا دیا جائے اور بتدریج ان کی ترقی مسدود کر دی جائے۔

تجویزِ تقسیم کے بعد پانچ ارکان پر مشتمل ایک کمیشن مرتب کیا گیا تاکہ وہ تقسیم کے نفاذ سے متعلق سفارشات پیش کرے۔ ڈھائی ماہ کے بعد ۱۶ فروری ۱۹۴۸ کی شب کو اس کمیشن نے رپورٹ شائع کی جس میں اعتراف کیا گیا کہ صورتِ حال انتہائی نازک ہے اور اس کے مزید بگڑنے کا احتمال ہے۔ عربی قوتیں اندرون و بیرون فلسطین، جنرل اسمبلی کے فیصلۂ تقسیم کو بزورِ شمشیر بدلنے پر کمربستہ تھیں اور یہودی بھی علیٰ ہذا القیاس اپنے مطالبہ پر اڑے ہوئے تھے۔ اختتامِ انتداب پر مکمل بدامنی پھیلنے کا خطرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ برطانیہ اور امریکہ نے بالکل یہی نتیجہ پیدا کرنا چاہا

تھا۔ کمیشن نے اس کے مقابلے کے لئے بین الاقوامی پولیس فورس قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ مشورہ ایک لحاظ سے نیا نہیں تھا کیونکہ اس کا پہلے سے ہی احساس پایا جاتا تھا لیکن امریکہ اس زعم میں تھا کہ وہ محض رعب سے عربی حکومتوں کو خاموش کرادے گا اور اس کے لئے قوت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ عرب روز بروز اپنے مطالبات میں متشدد ہوتے جارہے تھے۔ فلسطین کی مجلس اعلیٰ نے فلسطین کمیشن کو بتایا کہ عرب یہودی ریاست کی تشکیل کی ہر کوشش کو اقدام جنگ سمجھیں گے اور اس کا پورا مقابلہ کریں گے۔ عرب لیگ کے جنرل سیکرٹری عزام پاشا نے ۱۷ فروری کو اعلان کیا کہ اگر تقسیم کو قوت کے بل بوتے پر مسلط کیا گیا تو باقاعدہ عربی فوجیں تقسیم کا مقابلہ کریں گی۔ عربوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مارچ کے اوائل میں "نیویارک ٹائمز" کے نامہ نگار متعینہ قاصرہ نے یہ خبر بھیجی کہ عرب لیگ نے فیصلہ کیا ہے کہ امریکی کمپنیوں کو اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ ارکان عرب لیگ کی حدود مملکت میں پائپ لائنیں بچھائیں۔ شام کے متعلق خبر آئی کہ اس نے امریکی کمپنی کے اس اجارہ کی تصدیق کرنے سے انکار کردیا ہے جو چھ ماہ پیشتر طے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دلچسپی سے خالی نہ تھی کہ مصر بھی عرب لیگ کے فیصلہ کا پابند ہوگا اور حجاز بھی غالباً موجودہ کمپنیوں کے خلاف تعزیری کارروائی کرے گا۔ حالات نے امریکہ کو یقین دلا دیا کہ عرب گیدڑ بھبکیاں نہیں دے رہے بلکہ وہ واقعی ایسے عزائم رکھتے ہیں۔ فلسطین کمیشن نے عربوں کے عزم غیر متزلزل کی تصدیق کی تو امریکہ کی آنکھیں کھلیں۔ ٹرومین نے محسوس کیا کہ وہ یہودی ووٹوں پر عربوں کو آسانی سے قربان نہیں کرسکتا۔

فلسطین میں بین الاقوامی پولیس کے مسئلہ نے اور مصیبت پیدا کردی۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ کو امریکہ نے تقسیم کا فیصلہ منظور کرایا تھا۔ اُس وقت سے لے کر اب تک کے پانچ مہینوں میں بین الاقوامی صورت حال اور نازک ہوگئی تھی۔ چیکوسلوواکیہ میں دیکھتے دیکھتے اشتراکی حکومت مسلط ہوگئی تھی۔ خرس روس کا سایہ فن لینڈ پر پڑ رہا تھا۔ امریکہ روس کے مقابلے کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس کی نگاہ شمال میں ناروے پر تھی اور جنوب میں اٹلی پر۔ اٹلی میں انتخابات ہونیوالے تھے۔ پانچ مغربی قوتوں ـــــ برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، بلجیئم، لکسمبرگ کے مابین پچاس سال کا عسکری امداد کا معاہدہ ہوچکا تھا۔ جسے امریکہ کی "مارشل امداد" کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا۔ خود ٹرومین ایک حد تک جبری عسکری تربیت کی اپیل کرچکا تھا۔ ایسے نازک مرحلے پر امریکہ فلسطین میں بدامنی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بین الاقوامی فوجی مداخلت کا سوال بھی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اقوام متحدہ کے پاس منشور کی رُو سے کوئی ایسی عسکری تنظیم نہیں تھی اور اگر رکن قومیں انفرادی طور پر فوجیں مہیا کرتیں تو روسی فوجیں ضرور فلسطین آپہنچتیں۔ امریکہ کسی حال میں بھی رُوسی فوجوں کو فلسطین میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ ان گوناگوں مصائب میں مبتلا اور متضاد صُورتوں سے دوچار ہو کر امریکہ نے رجعت کی اور ۱۹ مارچ کو اچانک یہ اعلان کردیا کہ وہ اب تقسیم کا مؤید نہیں رہا۔ اس کے خیال میں فلسطین کو عارضی طور پر تولیت میں دے دیا جائے۔ نفاذ تقسیم میں جو خطرات و مہالک تھے اور جو سب کو نظر آرہے تھے، امریکہ نے پہلے ان کا انکار کیا، پھر اسے ان کی بے پناہی کے آگے جھکنا پڑا۔ اس رجعت نے نہ محض اس کے اپنے وقار کو صدمہ پہنچایا، بلکہ اقوامِ متحدہ کے ادارہ کو ایک بیکار ادارہ ثابت

کر دیا فلسطین اقوامِ متحدہ کی آزمائش تھا لیکن وہ اس میں پوری نہیں اُتری۔ اس جمعیتہ نے پورے تیرہ مہینے فلسطین کے معاملے پر بحث وتمحیص کی لیکن ناکام رہی۔

نئی صلیبی جنگ

امریکہ نے عارضی تولیت کی جو تجویز پیش کی وہ بھی منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اسی لیت ولعل، گومگو اور تذبذب میں ۱۵ مئی کی فیصلہ کن تاریخ آپہنچی۔ برطانیہ اپنی چال کے مطابق فلسطین کو خالی کر کے رخصت ہو گیا۔ یہودیوں نے اسرائیلی سلطنت قائم کر لی اور فلسطین ایک اور صلیبی جنگ کا میدان بن گیا۔ صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں دوسری صلیبی جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد صلیبی آج تک خطرے کا باعث نہیں بن سکے تھے۔ آلِ اسرائیل جو ایک دفعہ الٰہی انعام وفضائل سے محروم ہو کر تین ہزار سال سے لعنت وذلت ومسکنت کی وادیوں میں سرگرداں چلی آرہی تھی، اپنی ساری شیطنت کاریوں کے ساتھ قبلۂ اول کی مقدس گلیوں میں تہذیب وانسانیت کو ذلیل ورسوا کرنے لگی۔ یہودی "تابوتِ سکینت" کے طالوت کے عہد میں بھی مستحق نہیں تھے۔ اور وہ انھیں بطورِ انعامِ خداوندی عطا ہوا تھا تاکہ انہیں "ظالمین" کی بجائے "صابرین" اور "مومنین" بننے کا ایک اور موقع دیا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آلِ اسرائیل فطرت کی مہلت بخشیوں سے کبھی استفادہ نہیں کر سکی تھی۔ وہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ چالیس سال ہی صحراؤں میں آوارہ نہیں رہی بلکہ تاریخ کے سارے دور میں وہ صحرا سے نکل کر کسی "مصر" میں داخل نہیں ہو سکی تھی۔ یہودی

سود در سود، اور چور بازار کے ذریعے کمائے ہوئے سرمائے سے حاصل کردہ قوت اور اسلحہ سے وہی "تابوت سکینت" حاصل کرنے پر مضطرب تھے جو قوت اور سرمایہ سے نہیں بلکہ قانونِ مشیتِ ایزدی کے تحت ملتا ہے لیکن جو قوم فیضانِ سماوی سے محروم ہو جاتی ہے اس کے عمل و کمالات کی حد یہی فساد و طغیان ہوتے ہیں۔

یہودیوں نے ۱۵ مئی کے بعد فلسطین میں "اسرائیلی حکومت" کا اعلان کر دیا۔ اس کا مرکز تل ابیب تھا۔ اس حکومت کی حیثیت کیا تھی؟ اور اس کی سرحدیں کون سی تھیں؟ یہ خود یہودی بھی نہیں جانتے تھے لیکن بین الاقوامی سیاست کی عیارانہ حرکتوں نے اس حکومت کو کاغذی نہیں رہنے دیا۔ اسی سال امریکہ کا صدارتی انتخاب ہو رہا تھا۔ صدر ٹرومین گذشتہ انتخاب کے موقع پر نائب صدر منتخب ہوا تھا، لیکن روزویلٹ کی موت پر آئین کے مطابق صدر بن بیٹھا تھا۔ وہ اس منصب کو ہاتھ سے کہاں جانے دیتا۔ ڈیموکریٹک پارٹی جس کا کہ وہ نمائندہ تھا، گذشتہ سولہ سال سے برسر اقتدار چلی آ رہی تھی۔ بعض حلقوں میں اسی وجہ کو اس پارٹی کی شکست کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ ٹرومین ہر وہ حرکت کرنے کے لئے تیار تھا جو اُسے صدر بنائے رکھنے میں مفید ہوتی۔ یہودی اہم مہرہ تھے۔ چنانچہ اِدھر یہودیوں نے بے بنیاد اسرائیلی حکومت کا اعلان کیا اُدھر صدر ٹرومین نے اسے تسلیم کر لیا۔ "شکاگو ٹریبیون" نے اس حرکت پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۸ مئی کی اشاعت میں لکھا:

> ڈپلومیٹک عجلت میں ٹرومین نے ریکارڈ قائم کر دیا ہے (اسرائیلی حکومت تسلیم کرنے میں) ٹرومین نے آدھ گھنٹہ کا بھی انتظار نہیں کیا۔ حکومت کو تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن کوئی بھی نہیں جانتا کہ حکومت کیا ہے اور اس کی

حدود کون سی ہیں۔ ٹرومین نے یہ کچھ جاننے کا انتظار نہیں کیا۔ اس کی نظر یہودی ووٹوں پر تھی۔ یہی اس کی عجلت کی علت ہے۔

شرق اردن کے وزیر خارجہ نے کہا کہ شرق اردن کی اقوام متحدہ کی رکنیت کی درخواست پر حفاظتی کونسل نے کئی مرتبہ سفارش کرنے سے انکار کر دیا ہے لیکن امریکہ نے یہودی حکومت کو بلا وجہ فوراً تسلیم کر لیا ہے۔

روس نے بھی اسرائیلی حکومت کو تسلیم کرنے میں تاخیر روا نہ رکھی۔ امریکہ کے لئے یہ اور مصیبت پیدا ہو گئی۔ اس نے روس ہی کے ڈر سے تو تقسیم کا فوجی قوت سے نفاذ کرانا نہیں چاہا تھا۔ روس اس کے باوجود اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

جن حالات میں "اسرائیل" کا قیام عمل میں لایا گیا، ان پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ حقیقت روز روشن کی طرح سامنے آ جاتی ہے کہ یہ نتیجہ ہے منظم بین الاقوامی سازش کا۔ یہ دراصل میوۂ تلخ ہے اس تخم خبیث کا جسے عیسائیت اپنی روح کی گہرائیوں میں بوتی چلی آئی۔ صلیبی جنگوں میں اسی کی فصل پک کے تیار ہوئی تھی۔ اور ہلال اسلام کی درانتی سے خوب خوب کٹی تھی۔ یورپ کے استعمار نے اس فصل کی از سر نو آبیاری کی۔ انگریز اس ذہنیت کا زندہ مجسمہ تھا۔ چنانچہ اس کی پوری استعماری تاریخ اس نکتہ کی تفسیر ہے۔ اس برصغیر میں مسلمانوں کو اس نے حرف غلط کی طرح مٹانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ سلب و نہب سے بے دست و پا بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس نے برہمن سے ملی بھگت کی اور اس مہرے سے انہیں شہ مات دینے میں مصروف و منہمک رہا۔ جب اسے آخر کار برصغیر کو یوں آزاد کرنا پڑا کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہو گیا، تو

اس نے افراتفری مچادی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ پاکستان پہلے دن سے ہی یوں ہندو کے رحم و کرم پر ہو جائے کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہو۔ اس پر بھی وہ اقوام عالم کی صف میں بیٹھ کر پوری ڈھٹائی سے کہتا چلا آرہا ہے کہ اس نے خوشدلی سے برصغیر کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کیا۔

ایسی "خوش دلی" کا مظاہرہ فلسطین میں بھی ہوا۔ یہودی ترکِ وطن کے برساتی نالوں کا رُخ موڑ موڑ کر اس نے یہودی آبادی کو عربوں کے برابر کر دیا اور اسے ایک حکومت کی طرح مسلح ہونے کے مواقع مہیا کیے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ یہودی قزاق ہر طرح تیار ہیں تو از خود اپنے انخلاء کی ایک تاریخ مقرر کر کے فلسطین چھوڑ کے چلا گیا۔ اس نے اختیارات منتقل کرنے کی معروف صورت اختیار نہیں کی۔ اسے چاہئے تھا کہ حکومت مقامی نمائندوں کو سونپ دیتا اور کسی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ تھا تو اقوام متحدہ سے درخواست کرتا کہ وہ کوئی مناسب متبادل انتظام کر دے، یعنی خود اس انتظام کو سنبھال لے۔ اس نے ایسا نہیں کیا اور عربوں اور یہودیوں کی جنگ کے باوجود فلسطین کو چھوڑ دیا۔ اسرائیل کو معرضِ وجود میں لانے کی یہی واحد اور یقینی صورت تھی۔ یہودیوں اور عربوں کو لڑتا چھوڑ کر آجانے کے بعد اس نے اقوام متحدہ سے درخواست کی کہ وہ معاملے کو ہاتھ میں لے۔ اقوام متحدہ میں سازش کا رشتہ امریکہ نے سنبھال لیا اور اس نے اسرائیل کی غاصب حکومت پر عالمی مہرِ تصدیق ثبت کرا دی اور اس کا راستہ بھی ہموار کر دیا کہ اقوام متحدہ نے اپنی تجویزِ تقسیم میں جتنے علاقے یہودیوں کے لئے تجویز کئے تھے وہ ان سے کہیں زیادہ ہتھیا کر بیٹھ جائیں۔ فلسطین کا مسئلہ انیس سال سے اقوام

متحدہ کے روبرو پیش ہے۔ لیکن وہ اس رکن ملک کو اس حد تک مجبور کرنے پر آمادہ نہیں ہوئی کہ وہ اپنی علاقوں پر قناعت کرنے پر راضی ہو جائے جو اقوام متحدہ نے اپنے طور پر انہیں دینا چاہے تھے۔ اس کی وجہ سے گو عربوں کا موقف اقوام متحدہ کے باہر یہی ہے کہ غاصب حکومت اسرائیل کو ختم ہونا چاہئے لیکن اقوام متحدہ کے اندر وہ یہی مطالبہ کرتے چلے آرہے ہیں کہ اسرائیل کو ان حدود تک محدود کرنے پر مجبور کیا جائے جو اس کے لئے اقوام متحدہ نے متعین کی تھیں۔

انگریز نے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق فلسطین چھوڑ دیا تو فلسطین میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ یہ جنگ عربوں اور یہودیوں کے درمیان بھی تھی اور عربوں اور عربوں کے درمیان بھی۔ عربوں کے باہمی تعلقات کا یہ عالم تھا کہ وہ یہودیوں کے خلاف لڑتے لڑتے بھی آپس میں لڑنے سے باز نہ آئے اور لڑے بھی وہ فلسطین کے محاذ پر بلکہ ان کی نگاہ یہودی دشمن پر کم اور عرب ہمسائے پر زیادہ تھی۔ یعنی ان کی کوشش زیادہ تر یہ نہیں تھی کہ یہودیوں کا راستہ روکا جائے، بلکہ یہ کہ ان کا دوسرا عرب بھائی فلسطین کا کوئی حصہ یہودیوں سے چھین کر اپنے تصرف میں نہ لے لے۔ انہیں ڈر یہ تھا کہ جس کسی نے بھی فلسطین کا کچھ حصہ آزاد کرا لیا وہ اسی کی تحویل میں چلا جائے گا اور پھر اس کی سلطنت کی حدود اتنی تناسب سے وسیع ہو جائیں گی۔ وہ یہ گوارا نہیں کرتے تھے کہ کوئی عرب ملک ان کے مقابلے میں اس طرح پہلے سے زیادہ وسیع اور مضبوط ہو جائے۔ اس قسم کا تصادم اغراض مصر اور اردن (جو ان دنوں شرق اردن کہلاتا تھا) کے درمیان خصوصیت سے زیادہ تھا۔ اتفاق سے عربوں میں (شرق) اردن ہی ایک ایسا

ملک تھا جس کے پاس منظم اور جنگجو فوج تھی۔ چنانچہ گو مصر نے فلسطین کے جنوبی صحرا کے کچھ حصوں پر قبضہ کر لیا، اُردن نے دریائے اُردن کے مغرب کا اچھا خاصہ علاقہ آزاد کرا لیا اور مسلمانوں کے متعدد مقاماتِ مقدسہ، حتیٰ کہ یروشلم کے پرانے حصے کو بھی یہودیوں کی دستبرد سے بچا لیا، اس بنا پر وہ شرقِ اُردن سے اُردن بن گیا لیکن اس طرح ایک ایسی استخوانِ نزاع پیدا ہو گئی کہ عرب آج تک فلسطین کے بارے میں کوئی مشترک لائحہ عمل نہیں بنا سکے۔ اس کا افسوسناک مظاہرہ خصوصیت سے ۱۹۶۷ء میں ہوا جب اسرائیل نے اُردن کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا۔ ان دنوں قاہرہ سے باقاعدہ پروپیگنڈا ہوتا تھا کہ اُردن کی حکومت کو دستبردار ہو جانا چاہئے۔ گویا فوری مسئلہ اسرائیل کی جارحیت نہیں تھا، شاہ حسین کی معزولی تھا۔

اردن کا ردِ عمل اسرائیل کے خلاف بالعموم قابلِ تعریف رہا۔ شاہ حسین اس ناخواندہ اور غاصب مملکت کے اس حد تک خلاف ہیں کہ انہوں نے ایک شاہی مجلس اس مقصد کے لئے قائم کر دی کہ اُردن پر جارحانہ حملہ ہوا تو وہ خود لڑنے کے لئے محاذ پر پہنچیں گے اور وہ اگر کام آ گئے تو یہ مجلس کاروبارِ حکومت سنبھال لے گی۔ انہوں نے ان فلسطینیوں کو بھی حقوقِ شہریت دے دیئے جو اُن کے ملک میں آ گئے لیکن اس سے اصل مسئلہ حل ہونے کی بجائے اور اُلجھا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ الجھا دیا گیا ہے۔ یہودیوں نے جن علاقوں پر تسلط جمایا ہے، ان میں سے مسلمانوں کو نکال دیا گیا ہے۔ ان مظلومین کو عربوں نے اپنے ہاں ابھی تک آباد نہیں ہونے دیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ آباد ہو کر عرب ممالک میں

جذب ہو گئے تو فلسطین کو بھول جائیں گے اور اس طرح تحریکِ استخلاصِ فلسطین کو نقصان پہنچے گا۔ اس مؤقف کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما ہے کہ اگر فلسطینیوں کو متعلقہ ممالک میں آباد ہونے دیا گیا تو دریائے اردن کے مغرب میں جو فلسطینی اردن کے حصے میں آئے ہیں، انہیں اور ان کے علاقے کو اردن کا حصہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس سے بچنے کے لئے فلسطینی مظلومین کو اپنا شہری تسلیم نہیں کیا گیا چنانچہ صورت یہ ہے کہ کم و بیش تیرہ لاکھ مہاجرین ان کیمپوں میں گل سڑ رہے ہیں جو قائم تو مختلف عرب ممالک میں ہیں لیکن ان کا انتظام اقوامِ متحدہ کے ایک ادارے کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ادارہ بامرِ مجبوری یہ انتظام سنبھالے ہوئے ہے اور مہاجرین بڑی کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔ زندگی کی آسائشوں سے وہ بالعموم محروم ہیں اور نہ گھر کے ہیں نہ گھاٹ کے۔ عرب ممالک بہرحال اقوامِ متحدہ پر کڑی نکتہ چینی تو کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان بے گھر فلسطینیوں کے لئے مناسب انتظام نہیں کرتی لیکن وہ خود انہیں اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوتے، نہ ان کے مصائب کے ازالے کے لئے کوئی اقدامات ہی کرتے ہیں۔ اہلِ فلسطین ۱۹۴۸ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے تھے۔ اب تک ایک نئی نسل کیمپوں میں پیدا ہو کر جوان ہو چکی ہے۔ اس پوری نسل کا کیا ہو گا؟ اور بات ایک نسل کی نہیں، دوسری نسل ان کے پہلو بہ پہلو تیار ہو رہی ہے۔ ان کا کیا بنے گا؟ کون ذمہ دار ہے اس کا؟ یہ نسلیں کس گناہ کی پاداش میں "قتل" ہو رہی ہیں؟ ہر گذرنے والا سال عربوں سے یہ سوال پوچھتا ہے ـــــ اور ان کا دامن جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن عرب ایک دوسرے کا دامن کھینچ کھینچ کر انہیں تار تار کرنے سے ہنوز فارغ

نہیں ہو سکے۔ اور نہ توقع کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں تشتت و افتراق کی رَو کو روک سکیں گے۔

فلسطین کے مسئلہ پر عرب سربراہ بھی کئی بار مل بیٹھے ہیں اور عرب لیگ کے نمائندوں نے بھی بار ہا سر جوڑے ہیں۔ انہوں نے مشترکہ دفاع تک کا منصوبہ تیار کیا ہے لیکن کوئی عملی کام نہیں ہو سکا کیونکہ یہی طے نہیں پا سکا کہ فلسطین کو آزاد کیسے کرایا جائے۔ اس تجویز کو قبول نہیں کیا گیا کہ عرب ممالک مشترکہ جد و جہد کریں حالانکہ مل جل کر ہی یہودیوں کے خلاف مؤثر محاذ قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہ تجویز بار بار پیش کی جاتی ہے کہ فلسطینیوں کو منظم کر کے انہیں یہودیوں کے خلاف لڑنے دیا جائے اور پھر ان کی امداد کی جائے۔ گویا جس طرح الجزائری مجاہدین فرانس کے خلاف لڑے، اسی طرح فلسطینی یہودیوں کے خلاف لڑیں۔ یہ درست، لیکن اس تجویز کا محرک جذبہ یہ ہے کہ اس طرح فلسطین کا جو حصّہ اُردن کے پاس ہے وہ اُردن سے "آزاد" ہو جائے گا اور اُردن 'شرق اردن' بن کے رہ جائے گا۔ اسی جذبہ کے تحت یہ تجویز پیش ہوئی کہ مصر کی فوجیں بھی اُردن میں متعین کی جائیں تاکہ وہ یہودیوں کے خلاف لڑ سکیں۔ اس کا جواب، بجا طور پر، اُردن نے یہ دیا کہ اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لئے اوّل تو ہر ملک کی فوجیں ان سرحدوں پر موجود ہونی چاہئیں جو اسرائیل سے ملتی ہیں، دوسرے مصر کو اسرائیل ہی کے مقابلے کا خیال ہے تو وہ اپنی فوجیں یمن سے کیوں واپس بلا نہیں لیتا۔ واضح رہے کہ مصر کی نصف لاکھ سے زائد فوج کئی سالوں سے یمن میں مقیم رہی اور بلا واسطہ معزول امام یمن کے خلاف اور بالواسطہ شاہ فیصل کے خلاف برسرِ پیکار رہی۔ یہ

فوج اسرائیل کے خلاف کام میں لائی جا سکتی ہے اور لائی جانی چاہیئے لیکن عربوں کی باہمی رقابتوں کا یہ عالم ہے کہ ان کی قوت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے ہی ضائع ہو رہی ہے۔

اسرائیل کی زبانی مخالفت اور باہمی خانہ جنگی کا سنگین نتیجہ ۱۹۵۶ میں نکلا جب اسرائیل، فرانس اور برطانیہ نے مل کر مصر پر حملہ کر دیا۔ مصر ان میں سے کسی ایک طاقت کا بھی مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ لیکن روس کی مداخلت اور روس اور امریکہ کی مسابقت کے طفیل اس کھلی جارحیت کو روک دیا گیا۔ اور اقوام متحدہ نے مصر اور اسرائیل کی سرحد پر لیکن مصری علاقے میں بین الاقوامی فوج متعین کر دی۔ اس جارحیت سے چند ماہ پیشتر مصر نے نہر سویز کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ یہ پہلو بڑا خوش آئند ہے لیکن اصل مسئلہ جوں کا توں رہا۔ نہر سویز پر قبضہ کر لینے سے اسرائیل کی ناکہ بندی نسبتاً اور مضبوط ہو گئی لیکن محض اس طرح کی ناکہ بندی فیصلہ کن ثابت نہیں ہو سکتی۔ بین الاقوامی سیاست کا یہ عملی سبق بالکل نہیں بھولنا چاہیئے کہ کسی ملک کی ناکہ بندی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۳۵ میں اٹلی نے حبشہ پر حملہ کیا تھا تو اس وقت اقوام عالم نے اس کی ناکہ بندی کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جنوبی افریقہ کی ناکہ بندی کب سے ہو رہی ہے۔ رہوڈیشیا کی ناکہ بندی کا بھی فیصلہ ہو چکا ہے۔ ناکہ بندی کے یہ فیصلے کہیں زیادہ ہمہ گیر تھے کیونکہ بہت سی قومیں ان کی مؤید تھیں۔ اگر وہ نتیجہ خیز نہیں ہو سکے تو عربوں کی طرف سے اسرائیل کی محدود ناکہ بندی نمایاں طور پر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ناکہ بندی نہ کی جائے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تنہا ناکہ بندی

کہاں تک کامیاب ہو سکتی ہے۔ امریکہ اس ناکہ بندی میں نہ محض شریک نہیں وہ اس کے برخلاف ہے۔ چنانچہ عرب ایک راستہ بند کرتے ہیں تو امریکہ کے ہاتھوں کئی در کھل جاتے ہیں اور یہ در مسلسل کھل رہے ہیں۔ یہ سب کچھ عرب بھی جانتے ہیں اور ساری دنیا بھی جانتی ہے۔

اسرائیل عربوں کے لئے بہت بڑا خطرہ روزِ اول سے تو تھا ہی، اس کی سنگینی میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ کبھی سارے فلسطین میں یہودیوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ پھر صرف مقبوضہ فلسطین یعنی اسرائیل میں ان کی تعداد بیس لاکھ سے تجاوز کر گئی۔ یہ تعداد روز بروز بڑھائی جاتی رہی اور یہودی مسلسل اسرائیل میں درآمد کئے جاتے رہے۔ اسرائیل کے جارحانہ عزائم اپنی جگہ، محض بڑھتی ہوئی آبادی نے اس کے لئے توسیع ناگزیر بنا دی۔ گویا یہودی "مجبور" ہو گئے کہ وہ مزید عربی علاقے ہتھیائیں۔ یہ علاقے وہ عربوں سے ہی فتح کر سکتے تھے اور بالآخر انہوں نے فتح کر لئے۔ اس کے لئے انہوں نے شبانہ روز کوشش کی۔ وہ خطرناک جنگی تیاریاں کرتے رہے اور زیادہ سے زیادہ آبادی کے لئے جگہ پیدا کرنے کے لئے صحراؤں کو آبادکاری کے قابل بناتے رہے۔ جہاں تک جنگی تیاریوں کا تعلق ہے، اسرائیل، امریکہ کی شہ پر اور مدد سے ایٹمی طاقت بننے کی انتہائی کوشش کر رہا ہے۔ اس چور دروازے سے بھارت کو بھی مدد دی جا رہی ہے۔ عرب اسے جانتے ہوئے بھی بھارت کو دوست سمجھے جا رہے ہیں۔

اسرائیل نے عربوں کے لئے بالعموم اور اردن کے لئے بالخصوص ایک نیا فتنہ پیدا کر دیا۔ وہ یہ منصوبہ روبعمل لانے لگا کہ جھیل گلیلی کا پانی نکال کے اپنے صحراؤں کو

مزید یہودیوں کے لئے قابل رہائش بنائے۔ اس منصوبے کا مطلب یہ ہے کہ دریائے اردن جس پر اُردن کی معیشت کا دارومدار ہے خشک ہو جائے اور یہ ملک صحرا بن جائے۔ اردن کے کہنے پر عربوں نے اس کا جواب یہ سوچا کہ جو دریا جھیل گلیلی میں آ کے گرتے ہیں ان کا رُخ اُوپر سے ہی موڑ دیا جائے۔ اسرائیلی منصوبے کا یہ ایک حد تک جواب تو تھا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عرب ایسا کر گزریں گے؟ اسرائیل نے تو فیصلہ ہی نہیں کیا، وہ تو عمل بھی کرنے لگ گیا۔ عرب باتیں ہی کرتے گئے۔ وہ باتیں ہی کرتے تو توقع ہو سکتی تھی کہ آگے چل کر عمل کا مرحلہ بھی آ جائے گا۔ لیکن وہ باتیں کرتے کرتے آپس میں اُلجھ جاتے ہیں اور اسرائیل کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ یہ اس مسلسل جارحیت کا جواب نہیں جو برطانیہ اور امریکہ کی ملی بھگت سے اسرائیل کی شکل میں عربوں کے خلاف روا رکھی گئی اور جس نے عربوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا کر رکھا ہے۔

امریکہ کا کردار

دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکہ کی مزاجی کیفیت عجب تھی۔ جنگ کی آگ بھڑکی تو اس کی مِس خام کندن بنتی دکھائی دی لیکن یہ آگ فرو ہوئی تو اس کی بجھتی تپش سے امریکہ کا سونا مٹی بننے لگا۔ امریکہ جنگ میں تازہ دم شریک ہوا تھا اور جنگ اس کے ہاں سے دور دور رہی۔ متحارب ملکوں میں ایک امریکہ ہی تھا جو جنگ کی ہلاکت

بارریوں سے محفوظ تھا۔ محفوظ ہونے کا یہ احساس اس کا دماغ خراب کرنے کے لئے کچھ کم نہ تھا مگر اس پر مستزاد وہ دنیا کا واحد ایٹمی ملک بھی بن گیا۔ ایٹمی قوت کے زور پر وہ جاپان جیسی عسکری قوت کا زور توڑ چکا تھا۔ یہ غیر معمولی حربہ پہلی بار (امریکی) انسان کے قبضے میں آیا تھا اور دنیا اس کی تباہ کاری دیکھ کر دہشت زدہ ہو چکی تھی۔ امریکہ زبانِ حال سے پکار رہا تھا۔ **لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْم!** اور اس کا کسی سے کچھ جواب نہیں بن پڑتا تھا۔ دنیا دم بخود تھی لیکن مجرد طاقت ایک فیصلہ کن عنصر حیوانی سطح پر تو ہے، انسانی زندگی میں نہیں۔ انسانی زندگی میں مشیت اپنے انداز میں مصروف کار رہتی ہے اور ضرورت کے مطابق حیران کن طور پر ان قوانینِ طبعی کی کارفرمائی واژگوں کرتی رہتی ہے جو حیوانی زندگی میں روکے نہیں رکتے لگی۔ برطانیہ نے مزید چالاکی یہ کی کہ یہودیوں کے لئے مخصوص علاقوں میں سے اصل باشندوں کو بے دخل کرنا شروع کر دیا۔ بے دخل ہونے والوں میں مسلمان عرب ہی نہیں عیسائی عرب بھی تھے۔ اور تو اور عرب یہودیوں کو بھی ان علاقوں سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔ ان یورپی یہودیوں کو ہر طرح کے اسلحہ سے لیس کرایا گیا اور انہیں دہشت انگیزی کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔

فلسطین کا تاریخی پس منظر پیش کیا جا چکا ہے اور ایک حد تک تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ برطانیہ نے فلسطین پر یہودیوں کو مسلط کرنے کے لئے کیا چالیں چلیں اور کس چھل و فریب سے کام لیا۔ یہ بہت بڑی بین الاقوامی سازش کے تحت ہوا اور انگریز نے دھوکہ دینے اور جھوٹ بولنے کے بڑے گھناؤنے مظاہرے قدم قدم پر کئے۔ اس استعماری کارنامے کو خصوصیت سے پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے جو

برطانیہ عالمِ اسلام میں سرانجام دینے میں لگا ہوا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے نتیجے میں یورپ کے لئے ترکی خطرہ ختم ہوگیا تھا۔ ترکوں کو شکست ہی نہیں ہوئی تھی، اس خلافتِ عثمانیہ کی بساط قطعی طور پر تہ ہوگئی تھی جس سے یورپ لرزہ براندام رہتا تھا اور اسے ہر دم یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ اسلام کا سیلاب اسے اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ ترک ترکیہ میں گھر گئے اور خلافت سے دست بردار ہوگئے تو یورپ نے ایک حد تک اپنی مراد پائی۔ اپنے عزائم استعمار کی مزید تکمیل کی اس نے یہ صورت پیدا کردی کہ سلطنتِ عثمانی کے حصے بخرے کرکے ان میں بادشاہتیں قائم کردیں جو ترقی کیا بقا تک کے لئے برطانیہ کی محتاج تھیں۔ یہ بادشاہتیں عربوں کی تھیں۔ عرب پہلے ترکی خلافت میں شامل تھے لیکن برطانیہ نے انگریز کارندوں اور عرب گماشتوں کی وساطت سے ان اور معینہ نتائج پیدا کئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ دنیا ایک جنگل ہوتی اور مختلف انسان جانوروں کی نوعیں ہوتے تو امریکی درندہ اس جنگل کا بادشاہ بن چکا ہوتا۔ لیکن مشیت ہر آن انسان کی جستجو میں رہتی ہے۔ وہ انسانی زندگی کو انسانی سطح پر رکھنے کے لئے انسانی معاون تلاش کرنے میں کبھی ناکام نہیں ہوئی اور وہ کامیاب عین اُس وقت ہوتی ہے جب بظاہر اس کی ناکامی یقینی دکھائی دے رہی ہوتی ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکہ کو یقین ہو چلا تھا کہ اس نے مشیت کو ایٹم بم کے زور سے شکست دے دی ہے اور ساری دنیا اس کی حلقہ بگوش بننے ہی والی ہے لیکن امریکہ پر یہ حقیقت کھل جانے میں زیادہ وقت نہ لگا کہ ایٹم بم اپنی تمام تر خوفناکی کے باوجود اس کے لئے اک کاربے بنیاد ہے۔ وہ ایٹم بم سے شست باندھے دیکھتا ہی رہ گیا اور ایشیا میں استعمارِ فرنگ کے حلقہ ہائے

دام ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگے۔ وہ خود چین ہی سے بے آبرو ہو کر نہ نکلا بلکہ کوریا تک میں اسے منہ کی کھانی پڑی۔ امریکہ کی حرکات مذبوحی دیکھنے کے قابل تھیں۔ وہ جن ایٹمی دانتوں سے جاپان کو کھا گیا تھا وہ جاپان سے اِدھر کھانے کے نہیں، صرف دکھانے کے رہ گئے تھے۔ ایشیا میں خلافِ استعمار طوفان اٹھا تو امریکہ کا ایٹم بم اس کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بے بس دکھائی دیا۔ اس سیلِ بے پناہ کو روکنے کے لئے امریکہ نے ہند چینی میں جھنڈے گاڑ لئے اور آہستہ آہستہ جنوبی ویت نام کو استعماری مستقر میں تبدیل کر لیا۔ ویت نام کا محاذ تیار کیا جا رہا تھا تو ایشیا کے دوسرے کونے یعنی عالمِ عرب میں بھی ایک محاذ بڑی تیزی سے تیار کیا جا رہا تھا۔ دونوں استعمارِ فرنگ کے سنبھالے تھے۔ مشرقِ بعید میں جو کردار امریکہ ادا کر رہا تھا وہ کردار برطانیہ فلسطین میں ادا کر رہا تھا۔

اپنے سیاسی تسلط کے دوران برطانیہ نے فلسطین کو استعماری دسیسہ کاریوں کی آماجگاہ بنا دیا تھا۔ یہ ہوسِ استعمار ہی کی کرشمہ سازی نہیں تھی بلکہ اس بے پایاں نفرت کا نتیجہ بھی تھا جو سینۂ عیسائیت میں اسلام کے خلاف کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور جسے صلیبی جنگوں کے سلسلے میں مجنونانہ طور پر ہوا دی جاتی رہی تھی۔ یورپ کے نزدیک برطانیہ کا فلسطین پر قبضہ صدیوں سے لڑی جانے والی صلیبی جنگوں کے معرکوں میں سے ایک اہم معرکہ تھا اور اس کی خواہش تھی اور کوشش بھی کہ یہ معرکہ فیصلہ کن ہو اور صلیب کو ہلال پر قطعی فتح حاصل ہو جائے۔ پہلی جنگِ عظیم میں انگریزوں نے فلسطین پر قبضہ کیا تو فیلڈ مارشل ارل ایلن بی بادردی ہونے کے باوجود ننگے سر اور ننگے پاؤں بیت المقدس میں داخل ہوا اور

اس نے کہا! اے خدا! اے مسیح مقدس! تیرے کرم سے آج صلیبی جنگ ختم ہوئی چنانچہ قابض ہونے کے بعد برطانیہ نے بڑی دیدہ دلیری اور پرکاری سے سفید فام یہودانِ یورپ کا رُخ فلسطین کی طرف موڑ دیا۔ کہنے کو ان کی آمد کے لئے ایک تناسب مقرر کیا گیا لیکن عملاً ان کے لئے فلسطین کے دروازے چوپٹ کھول دیئے گئے اور پہلے سے طے شدہ علاقوں میں انہیں مسلط کیا جانے لگا۔ فلسطین میں یہودیوں کی آبادی بہت بڑی بین الاقوامی سازش تھی اور یورپ اور امریکہ کے افسانوی حد تک متمول یہودی اور یہود نواز طبقے اس کے پشت پناہ تھے۔ برطانیہ کی شہ اور یورپ اور امریکہ کی معاونت کے نتیجے میں فلسطین میں یہودیوں کی تعداد چند فی صد سے بڑھ کر عربوں کے ہم پلہ ہونے میں ترکوں کے خلاف جذبات پیدا کئے اور جغرافیائی آزادی کے سبز باغ کا وہ منظر دکھایا جس سے وہ پہلی بار آشنا ہوئے۔ برطانیہ نے مکر و زور سے ان کی آنکھیں خیرہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس طرح عالمِ عرب کا جو نقشہ اُبھر کر سامنے آیا وہ استعماری سازش کا شاہکار تھا۔ عرب ترکوں کے خلاف لڑے ہی نہیں تھے، ان کے دلوں میں ترکوں کے خلاف زہریلا مواد بھی بھر دیا گیا تھا۔ اس طرح ترک و عرب مفاہمت ناممکن بنا دی گئی لیکن خود عربوں میں منافرت کے ایسے بیج بو دیئے گئے جن کے ثمراتِ تلخ آج تک منہ کا مزہ بگاڑے ہوئے ہیں۔ ایک تو یوں شاہانِ عرب برطانیہ کے رحم و کرم پر تھے، دوسرے ان کے درمیان ذاتی اور خاندانی خصومتیں اور رقابتیں تھیں چنانچہ مجموعی طور پر عرب ترکوں کے خلاف رہے اور فرداً فرداً آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ برطانیہ ان کے تار ہلاتا رہا اور تماشا بھی دیکھتا رہا اور فائدہ بھی

اٹھاتا رہا۔

عالمِ عرب کا یوں حلیہ بگاڑنے کے ساتھ ساتھ استعمارِ فرنگ نے فلسطین کو اس مقصد کے لیے چنا کہ اگر عربی علاقوں سے یورپ کا سیاسی تسلط ختم بھی ہو جائے تو اس کے استعماری عزائم کی تکمیل کی یقینی صورت موجود ہو اور رہے ایسی صورت اسرائیلی حکومت کے قیام سے پیدا کی گئی۔ جو یہودی فلسطین میں لائے گئے تھے وہ یورپ نژاد تھے۔ پھر انہیں مسلح کر کے دہشت انگیزی کی راہ پر ڈال دیا گیا تھا اور اس دہشت انگیزی کا رُخ عربوں کی طرف موڑ دیا گیا تھا۔ گویا یہ اہتمام کر لیا گیا تھا کہ عربوں اور یہودیوں میں مفاہمت نہ ہو سکے اور وہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہیں۔ البتہ یہودی اس حد تک طاقتور ضرور ہوں کہ وہ عربوں سے دب نہ سکیں بلکہ انہیں نیچا دکھا سکنے کے قابل ہوں۔ یوں اسرائیل کا ولدِ یورپ بطنِ فلسطین سے نمودار ہوا۔ یہی یورپ کا منشا تھا اور یہی استعماری چال تھی۔ قضیہ فلسطین کی تاریخ کا کسی طور اور کسی نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کیا جائے اس نتیجے سے مفر ناممکن ہے کہ یہ استعماری عزائم کی کارفرمائی ہے۔ اول تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ سفید فام یہودیوں کو فلسطین میں جائز و ناجائز ذرائع سے لا لا کر بسایا جاتا لیکن اگر بالفرض اس کا کچھ جواز تھا تو ہونا یہ چاہیئے تھا کہ برطانیہ فلسطین پر اپنا انتداب ختم کرتا تو فلسطینی نمائندے اختیاراتِ حکومت سنبھالتے اور برطانیہ کی بے دخلی کے بعد فلسطین میں جو نظمِ سیاسی تشکیل پذیر ہوتا، اس میں یہودی اپنی آبادی کے تناسب کے مطابق شریک کر لیے جاتے۔ لیکن برطانیہ نے یہ غیر معمولی اور ناقابلِ جواز اقدام کیا کہ فلسطین کو اس انداز سے چھوڑا کہ اسرائیل خود بخود قائم ہو گیا حالانکہ اہلِ فلسطین نے تقسیم کا مطالبہ

نہیں کیا تھا۔

برطانیہ درمیان سے نکل گیا تو یہودی ایک ملک اور حکومت بن گئے اور اعراب فلسطین سے براہِ راست متصادم ہو گئے۔ عالمِ عرب اس گہری استعماری چال کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ اس کی متفرق حکومتوں نے اپنے طور پر اس کا مقابلہ تو کیا لیکن نہ تو وہ اس سازش کی گہرائی سمجھ سکیں اور نہ اس کے مقابلے کے لئے کوئی مشترکہ محاذ قائم کر سکیں۔ عرب یوں بھی اس خطرے کے حریف نہ ہو سکتے اور ناکام ہوتے لیکن برطانیہ اس ڈرامے کا ایک اور منظر سامنے لے آیا اور ایک نئے اور وسیع تر محاذ پر پہنچ کر اسرائیل کے استحکام اور عربوں کی شکست کے لئے کام کرنے لگا۔ وہ امریکہ کو پہلی جنگِ عظیم ہی کے وقت اس سازش میں شریک کر چکا تھا۔ دوسری جنگ کے بعد وہ امریکہ کو اس ڈرامے کا مرکزی کردار بنانے پر مجبور بھی ہو گیا اور تیار بھی۔ اس لئے بھی کہ جنگ نے اسے یہ بار خود اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا اور اس لئے بھی کہ یہودیوں کے بے پناہ اثر اور استعماری ذہن کی بناء پر امریکہ ہی اس ذمہ داری کے لئے اہل اور موزوں تھا۔ یورپ نژاد امریکہ کا خمیر استعماری تو تھا لیکن دوسری جنگ کے بعد ایٹم بم کی اجارہ دارانہ ملکیت کے باوجود اسے عالمی سطح پر جو پسپائی ہوئی، اس نے امریکہ کی نفسیات کو نہایت متشدد کر دیا اور وہ یورپ کی زہریلی ذہنیت کی علامت بن کر سراپا زہر بن گیا۔ زہر بھی بقول اقبالؒ — آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب — اس زہر سے فلسطین کی رگِ جان کی تواضع کرنے کے لئے برطانیہ اقوامِ متحدہ پہنچا اور سادگی اور پُرکاری سے اپنی معذوری کی دہائی دے کر اس نے اسرائیل کے ولدِ یورپ کو

امریکہ کی گود میں پھینک دیا۔

اقوامِ متحدہ میں سازش کا دوسرا محاذ کھل گیا۔ وہاں تقسیم کے لئے منصوبہ وضع کیا گیا اور عربوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ جنگ بند کر کے اسرائیل سے امن و صلح کی بات کریں۔ استعماری سازش کو بین الاقوامی سندِ جواز عطا کرنے کی یہ طفلانہ کوشش تھی۔ اس طرح وہ کج خشتِ اول رکھی گئی جس پر بیس سال سے کج دیوار اٹھتی چلی آ رہی ہے۔ اقوامِ متحدہ نے اپنے فیصلے کی رُو سے اسرائیل کی حدود سلطنت مقرر کیں۔ یہ تحدید اصلاً نامنصفانہ تھی کیونکہ اسرائیل کو وہ علاقہ دیا جا رہا تھا جو اقوامِ متحدہ کا نہیں بلکہ عربوں کا تھا اور جسے عرب دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ بہرحال جب تقسیم کی تجویز سامنے آئی تو پتہ چلا کہ یہودی برطانوی سازش کے طفیل اقوامِ متحدہ کی بخشش سے زیادہ علاقہ ہتھیا چکے ہیں۔ یہ علاقے خالی کرنے پر انہیں مجبور نہیں کیا گیا۔ الٹا عربوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ براہِ راست گفتگو سے "زاید" علاقے خالی کرائیں۔ ایسا کرنے کی وجہ ظاہر تھی۔ امریکہ عربوں کو اس طریقے سے مجبور کر رہا تھا کہ وہ ولدِ یورپ کو جائز اولاد سمجھیں اور اپنے ہاں رکھ کے اس کی رضاعت اور پرورش گوارا کریں۔ یہ علاقے آج تک خالی نہیں ہوئے۔ اسرائیل نہ پیچھے ہٹنے پر تیار ہوا اور نہ اُسے اس پر آمادہ یا مجبور ہی کیا گیا۔ علاقائی امن اور اقوامِ متحدہ کے وقار کا تقاضا تھا کہ اسرائیل کو ان حدود تک محدود کر دیا جاتا جو عالمی ادارے نے اپنے طور پر اور اپنے مصالح کی بناء پر متعین کی تھیں۔ لیکن یہ تحدید اسرائیل کو پیچھے ہٹانے کے لئے نہیں، عربوں کو شکست اور رسوائی کو دوام بخشنے کے لئے کی گئی تھی۔ استعمارِ یورپ کا کلیجہ

ٹھنڈا تھا کہ جس فصلِ صلیبی کو صلاح الدین نے کاٹ کے رکھ دیا تھا وہ پھولتی پھلتی مزرعِ فلسطین تک پہنچ چکی ہے اور صلیبی جنگوں کے مقصود و منتہا کو حاصل کرنے کے لئے اسرائیل کا ایسا تختہ مہیا کیا جا چکا ہے جس پر سے ایک جست حصولِ مراد کو یقینی بنا دے گی اور فلسطین کا قصہ تمام کر دے گی۔

امریکہ شغلِ استعمار میں رہا اور اقوامِ متحدہ تماشہ دیکھتی رہی۔ شغل اور تماشہ اپنی جگہ، فلسطین میں جو صورتِ حال پیدا کر دی گئی تھی وہ ایک حال پر رہ نہیں سکتی تھی۔ استعمار کی ہر تعمیر میں یہی خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے کہ وہ ایک حال میں رہ نہیں سکتی تھی اور جب حال دگرگوں ہوتا ہے تو ساری تعمیر متزلزل ہو جاتی ہے۔ وہ زمین گیر ہو تو، فلک بوس ہو تو، اس کے برقرار رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرار پختہ بنیاد کے لئے ہے۔ اور بنیاد وہی پختہ ہے جو انسانی قلب کی گہرائی سے اٹھے۔ استعمار، استحصال اور دجل کو انسان نے نہ کبھی دل سے قبول کیا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔ انسانی زندگی میں اس سے بڑا کارِ بے بنیاد اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان نوعِ انسان کا شکار کرے۔ لیکن یورپ کا انسان ہنوز ارتقاء کی اس منزل میں ہے جس میں شیر کی شیری کے فسانے کا تو چلن ہے، تہذیب و اخلاق کی اقدار کا گذر ممکن نہیں ہو سکا۔ اور کبھی اس بادِ نسیم کا ہلکا سا جھونکا ادھر آیا بھی ہے تو بادِ سموم کہہ کر اس نے اس سے ابا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ نے ایک سے ایک ٹیڑھی اینٹ استعمال کرنے پر اصرار کیا ہے۔ ان ٹیڑھی اینٹوں کا ہی نتیجہ تھا کہ ۱۹۵۶ میں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل مل کر مصر پر چڑھ دوڑے۔ وہ اس پر وقفِ التہاب تھے کہ فلسطین کی مٹی میں یورپ نے جو تخمِ استعمار بویا تھا وہ آٹھ سال تک بار آور نہیں ہو سکا تھا اور

اس دوران میں سپلہرِ برین نے جو رنگ بدلے تھے وہ یورپ کے لئے نظر افروز نہیں ہو سکے تھے۔ اس صدی کے نصفِ آخر میں یہ عریاں جارحیت استعمارِ فرنگ کے دیدۂ بے غیرت ہی کی کارستانی ہو سکتی تھی۔ اور جب تک یہ آنکھ باقی ہے اس کارستانی کے مظاہرے ہوتے رہیں گے۔

جارحیت کا ۱۹۵۶ کا مظاہرہ بدیہی طور پر بلا جواز تھا۔ عالمی سطح پر اس کی بجا طور پر مذمت ہونے لگی تو امریکہ کے لئے اپنے استعماری گماشتوں کا اعلانیہ ساتھ دینا آسان نہ رہا۔ اس کی کوشش سے جنگ بند کرا دی گئی اور اقوامِ متحدہ کی فوج نگرانی کے لئے مصری علاقے میں بھیج دی گئی۔ جارحیت کی مخالفت کر کے امریکہ نے وہ کام کیا جو اس کے گماشتے جارحیت کے زور پر نہیں کر سکے تھے۔ اقوامِ متحدہ کے سائے میں ایلیہ کی بندرگاہ اسرائیل کی تحویل میں دے کر عقبہ کی خلیج اس کے لئے کھول دی گئی۔ اس سے عربوں نے اسرائیل کی جو ناکہ بندی کر رکھی تھی اس میں رخنہ پڑ گیا۔ گویا بجائے اس کے اسرائیل کو مجبور کیا جاتا کہ وہ اقوامِ متحدہ کی حد بندی قبول کر کے پیچھے ہٹتا اسے اور علاقہ دلوا دیا گیا اور ایک سمندری راستہ اس کے لئے کھول دیا گیا۔ اس سے یہ مسئلہ اسرائیل کے لئے شدت اختیار کر گیا کہ یہ آبی گزرگاہ کھل گئی ہے تو آئندہ کے لئے کھلی رہے۔ اور اس کے علاوہ نہر سویز بھی اس کے لئے اسی طرح کھل جائے تاکہ بیرونی دنیا سے اس کے روابط رواں ہو جائیں۔ یوں ایک جارحیت سے دوسری جارحیت کا جواز نکلنے لگا۔

اسی صورتِ حال کی پیش بندی کے طور پر مصر نے نہر سویز کو پوری طرح اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ بین الاقوامی قبضے میں ہونے کی وجہ سے نہر کسی وقت

بھی ایک نہ ایک بہانے سے اسرائیل کے لئے کھل سکتی تھی۔ پیش بندی کی یہی صورت تھی کہ نہر کا انتظام کلیتہً مصر کے پاس آجائے۔ مصر نے یہ انتظام اپنے ذمے لے بھی لیا، اور اسے یورپی طعن و استہزار کے باوجود حسن و خوبی سے چلا کے دکھا بھی دیا۔ لیکن یہ صورتِ حال ایسی تھی کہ اس کی "نند" اس کے اندر سے پھوٹ پھوٹ کے نکل رہی تھی۔ اس کو قرار ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ امریکہ براہِ راست بھی اور اپنے حواریوں کے ذریعے سے بھی اسرائیل کی صلاحیتِ جارحیت میں اضافہ کرتا رہا۔ جارحیت ـــــ مسلسل اور بھرپور جارحیت ـــــ کے بغیر وہ مقصد پورا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا جس کے لئے استعمار یورپ نے اسرائیل کا تخم خبیث زمینِ عرب میں بویا تھا۔ یہ تیاری جاری رہی اور جون ۱۹۶۷ میں اس کا نتیجہ دنیا بھر نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اپنا منصوبہ مکمل کرنے کے بعد اسرائیل نے اچانک عربوں پر حملہ کر دیا اور چار دنوں کے اندر اندر سب کو بے بس کر کے نہر سویز کے مشرقی کنارے تک جا پہنچا۔ اس بہت بڑی اور حیران کن فتح سے اسرائیل اپنے مقصد کے بہت قریب تو پہنچ گیا لیکن اسے پوری طرح حاصل نہ کر سکا۔ اب وہ خلیج عقبہ اور نہر سویز دونوں کے ایک ایک کنارے پر قابض ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں آبی راستے اس کی مرضی کے بغیر چل نہیں سکتے لیکن وہ انہیں از خود رواں نہیں کر سکتا۔ اور یہ راستے نہ کھلیں تو اس کی معیشت خاصی تنگ رہے گی۔ یہ ہے تو تعطّل لیکن تعطّل ایسا ہے جو عظیم طوفان لانے کا موجب ہو سکتا ہے ـــــ اور ہو کے رہے گا۔

عرب فی الوقت شکست خوردہ ہی سہی لیکن وہ اس شکست کو دائمی سمجھنے کے

لئے تیار نہیں۔ یہ ہے بھی درست۔ اس قسم کے نشیب و فراز حرفِ آخر نہیں ہوتے۔ یورپی دنیا میں اس شکست کا بہت چرچا کیا گیا ہے اور مزے لے لے کے اس داستان کو دہرایا گیا ہے۔ امریکہ، برطانیہ وغیرہ ممالکِ مغرب میں جنگ کے دوران یوں لگتا تھا کہ وہ اسرائیل کے دوش بدوش لڑ رہے ہیں۔ اسرائیل کی فتح پر وہ خوشی سے پاگل ہوئے جاتے تھے۔ یہ حیثیت مجموعی وہ یہی چاہتے تھے کہ اسرائیل کی فتح مکمل بھی ہو اور دائمی بھی ثابت ہو۔ امریکہ نے حسبِ عادت اقوام متحدہ میں اسرائیل کی جنگ خوب لڑی۔ ایشیا و افریقہ کے بہت سے ممالک نے بڑی دلسوزی سے اقوامِ متحدہ پر زور دیا کہ وہ اپنے مؤقف کے مطابق اسرائیل کو عرب علاقے خالی کرنے پر مجبور کرے۔ روس نے ان ممالک کی ہمنوائی کی۔ سلامتی کونسل کے اونٹ کو کسی کروٹ بیٹھتے نہ دیکھ کر روس نے جنرل اسمبلی کا ہنگامی اجلاس بھی طلب کرا لیا لیکن امریکہ نے ایک نہیں چلنے دی اور اقوامِ متحدہ پر ہر پہلو سے دباؤ ڈال کر اس نے یہ فضا پیدا کر دی کہ اجلاس بے معنی ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ اسرائیل کی جارحیت کی مذمت کرنا تو درکنار، اجلاس کے لئے یہ اعلان تک کرنا ممکن نہ رہا کہ اس کی خواہش یہ ہے کہ اسرائیل عرب علاقے خالی کر دے۔ امریکہ نے بڑی دیدہ دلیری سے اور کامیاب کوشش کی کہ اقوامِ متحدہ کوئی دوٹوک رائے کا اظہار نہ کر سکے۔ امریکہ کا مقصد ظاہر ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ عرب ممالک اسرائیل کے ولدِ یورپ واستعمار کو قبول کر لیں اور اس کے روبرو ہو کر اپنی شکست کا اعتراف کریں اور امن کی بھیک مانگیں تاکہ یورپ کی یہ چھاؤنی برقرار رہے اور امریکہ اس کی وساطت سے عالمِ عرب کو زیرِ استعمار رکھ سکے۔

اسرائیل کے متعلق بھی یہ بنیادی حقیقت سامنے رکھنے کے قابل ہے کہ اسرائیل اور ویت نام امریکہ کے وہ اڈے ہیں جہاں سے وہ ایشیا میں استعمار کی پسپائی کا سلسلہ روکنے میں لگا ہوا ہے۔ ویت نام چین کے خلاف اڈہ ہے اور اسرائیل، عالم اسلامی کے خلاف۔ یورپ کے غلبہ و استیلاء کے خلاف پچھلی صدی کے آخر میں اور اس صدی کے شروع میں جو تحریکیں اٹھی تھیں وہ چین اور عالم اسلامی ہی سے اٹھی تھیں۔ امریکہ حریت کے یہ دونوں سرچشمے پاٹ دینے میں لگا ہوا ہے لیکن امریکہ کی تدبیر پر تقدیر کچھ اس طرح خندہ زن ہے کہ اسرائیل اور ویت نام میں وہ اس حد تک ننگا ہو گیا ہے کہ اس کے حق میں وہ چند کلمات جواز بھی نہیں کہے جا سکتے جو ان اقوام یورپ کے حق میں کہنے کو کہے جاتے ہیں جن کا ممالک ایشیا پر سیاسی تسلط رہا۔ امریکہ کی موجودگی کا کوئی جواز نہ ویت نام میں ہے نہ اسرائیل میں۔ اس کی یہ دیدہ دلیرانہ موجودگی خلاف استعمار قوتوں کے لئے کھلی دعوت مبارزت ہے۔ یہ قوتیں ابھر کر متحد ہوتی جا رہی ہیں اور استعمار فرنگ کے خلاف ایک عالمی محاذ قائم کرنے میں کوشاں بھی ہیں اور ایک حد تک کامیاب بھی۔ اس محاذ کی تشکیل اور کامیابی میں وقت لگے گا، اس لئے بھی کہ مقابلہ سخت ہے اور اس لئے بھی کہ بھارت جیسا عظیم ایشیائی ملک امریکہ کا گماشتہ بن کر اس عالمگیر محاذ کے قیام میں رخنے پیدا کرنے کا موجب بن گیا ہے جو امریکی استعمار کے خلاف ایشیا میں تیار ہو رہا ہے۔ بھارت ویت نام میں بغض چین کا مظاہرہ کر رہا ہے اور اسرائیل میں بغض پاکستان کا۔ حریت و آزادی کی موج بیباک کا ساتھ دینے کی بجائے وہ اس فکر میں ہے کہ کہیں اس میں امریکی استعمار کا گھر نہ بہ جائے۔ اس نے اپنی تمام تر

امیدیں امریکہ سے وابستہ کرلی ہیں۔ ویت نام اور اسرائیل ایشیا کے لئے استعمار کی واپسی کے کھلے راستے ہیں تو بھارت کے لئے امریکہ تک پہنچنے کے چور دروازے۔ بھارت نے عربوں کی شکست پر اسی طرح شادیانے بجائے جس طرح مغرب میں بجائے گئے۔ اسرائیل استعمار کا کھلا خنجر ہے تو بھارت اس کا پنہاں دشنہ۔ لیکن ایشیا کے بعض ممالک اس کے منہ کے رام رام سے زیادہ متاثر ہیں اور اس کی بغل کی چھری سے بہت حد تک غافل ہیں۔ اس سے خلاف استعمار محاذ کے قیام میں تاخیر ہو رہی ہے۔ لیکن جیسے امریکہ بے نقاب ہو گیا ہے اسی طرح اس کا حلقہ بگوش بھارت بھی بے نقاب ہو کے رہے گا۔ بھارت بے نقاب ہوتا جائے گا تو محاذ مستحکم ہوتا جائے گا۔ امریکہ اور بھارت مل کر بھی اس روزِ حساب کو ٹال نہیں سکتے جو آتا دکھائی دے رہا ہے ـــــ اور آ کے رہے گا!

دوستی اور دشمنی کا بین الاقوامی تصور

ابواب گذشتہ میں مسئلہ فلسطین کے عسکری، تاریخی اور سیاسی پہلوؤں کا جائزہ لیا جاچکا ہے۔ اس مسئلے کا پس منظر اور پیش منظر سمجھنے کے لئے یہ جائزہ خاصا جامع ہے لیکن جون ۱۹۶۷ کی اسرائیلی جارحیت نے ایک اور پہلو ایسا ابھارا ہے کہ اس کا جائزہ لئے بغیر مسئلہ فلسطین کا مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ سوال یہ ہے کہ بین الاقوامی میدان میں دوستی اور دشمنی کا معیار کیا ہے اور عرب کس کو کس حد تک دوست سمجھ سکتے ہیں اور کس کو کس حد تک دشمن۔ یہ سوال اس لئے ابھر کر سامنے آیا کہ عربوں اور عربوں کے حامیوں نے روس سے خاص قسم کی توقعات وابستہ کیں اور وہ پوری نہ ہوئیں تو انہیں از حد دل برداشتگی ہوئی۔ اس سوال کے جواب کے لئے قدرے تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔

ہر چند اسرائیلی جارحیت کی براہِ راست زد اردن، مصر اور شام پر پڑی اور انہیں اچانک ایسے ابتلائے عظیم سے دوچار ہونا پڑا جس کے ہمہ گیر اثرات سے فارغ ہونے کے لئے ایک عرصہ درکار ہے تاہم اس کے متحارب فریق ایک طرف اسرائیل تھا اور دوسری طرف عرب ممالک تھے جس طرح اسرائیل

کا قیام عمل میں لایا گیا تھا اور جس انداز سے اس کی پیٹھ ٹھونک کے اسے بھونکنے اور کاٹنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا اس کے پیشِ نظر یہ یقین عالمگیر تھا کہ اسرائیل ولدِ یورپ ہے اور برطانیہ اور امریکہ نے عالمِ عرب پر اسے مسلط ہی اس لئے کیا ہے کہ جو کام باپ سے ہوتے ہوتے رہ گیا تھا اسے بیٹا پورا کرے۔ اس اعتبار سے اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ صیہونیوں اور عربوں کی جنگ میں اسرائیل کو برطانیہ اور امریکہ کی پشت پناہی حاصل ہوگی۔ گویا جہاں مقامی طور پر ایک فریق اسرائیل تھا وہاں عالمی سطح پر دُہرا فریق اسرائیل، برطانیہ اور امریکہ پر مشتمل تھا۔ اسی طرح دوسرا فریق مقامی طور پر اعراب تھے تو عالمی سطح پر اعراب اور روس تھے۔ عربوں اور عربوں کے حامیوں کو روس کی دوستی کا یقین نہ بربنائے خوش فہمی تھا نہ اسے ہنگامی تاثر کہا جاسکتا ہے۔ خود روس کی سیاست اور مصلحت کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ عالمِ عرب میں برطانوی امریکی اثر کو زائل یا کم کرنے کے لئے اسرائیل کی مخالفت کرے اور عربوں کی حمایت۔ جنگ سے فوراً پہلے اس کے اعلانات اور اقدامات نے اس یقین کو بطورِ خاص تقویت پہنچائی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اور عام طور پر معلوم ہے، روس نے اسرائیل، برطانیہ اور امریکہ کو انتباہ کیا کہ جنگ کی طرح نہ ڈالیں اور ترکیہ سے اجازت لے کر اپنا بحری بیڑہ بحیرۂ اسود سے بحیرۂ روم میں بھیج کر عربوں سے اپنی دوستی اور حمایت کا عملی ثبوت مہیا کیا۔

یہ یقین کہ روس اسرائیل کا نہیں بلکہ عربوں کا حامی ہے ہنگامی تاثر کا نتیجہ تو نہ تھا لیکن اس پر سادگی سے خوش فہمیوں کا جو محل تعمیر کر لیا گیا وہ سرتاسر

بے بنیاد اور بے جواز تھا اور یہ بالکل حیران کن نہیں کہ دشمن کی توپوں کی پہلی ہی گرج میں وہ زمین بوس ہو گیا۔ اقوامِ عالم کے مابین تعلقات اور روابط کی اساس اور دوستی اور دشمنی کا معیار بین الاقوامی سیاست کا بنیادی مسئلہ ہے۔ واقعات نے بڑی سختی اور بعض اوقات بڑی بے رحمی سے اس کا جواب ہمیں سمجھایا ہے۔ پھر بھی اسے سمجھنے اور ازبر کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ پاکستان کی اپنی مثال سامنے لانے سے اس نکتے کی وضاحت زیادہ آسان ہو جائے گی۔ پاکستان نے جس دنیا میں آنکھ کھولی وہ پاکستان شناس نہیں تھی۔ اس کے ہمسایوں نے اسے ناخواندہ سمجھا اور اس کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائیں تاکہ دنیا بھر میں وہ ناخواندہ ہی سمجھا جاتا رہے۔ انہی غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا کہ اسرائیل کو پوری طرح مقہور و مردود سمجھ کر بھی وہ عربوں میں مناسب احترام کی نگاہ سے نہ دیکھا گیا اور بھارت اسرائیل سے براہِ راست تعلق رکھنے کے باوجود اپنی قدر و منزلت نہ کھو سکا اور عرب اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے رہے۔

پاکستان نے عالمی محفلوں میں اعلیٰ سیاست دانوں کو اخلاق و ضوابط اور اقدارِ انسانی کی باتیں کرتے دیکھا تو وہ مطمئن ہو گیا کہ یہ دنیا اشراف کی بستی ہے اور حق و انصاف کی گفتگو مخلصانہ اور ایمان دارانہ ہے۔ وہ بھول گیا کہ اس کی پیدائش کن حالات میں ہوئی اور بھارت اور برطانیہ نے اس سے کس طرح قدم قدم پر دھوکہ کیا۔ بین الاقوامی سیاست کے محرکات وہ اس وقت بھی سمجھ نہ سکا جب افغانستان جیسے ہمسائے نے اقوامِ متحدہ میں اس کی رکنیت کے خلاف رائے دی۔ وہ اس پر بھی حیران نہ ہوا کہ کشمیر جیسے انسانی مسئلے پر اول تو کوئی زبان نہیں

کھولتا اور کوئی لب کشائی کرنے پر آتا ہے تو بلا واسطہ نہیں تو بالواسطہ بھارت ہی کی طرف داری کرتا ہے ۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ اصول کی باتیں کرنے والے عملاً اصول پرست بھی ہیں اور چونکہ پاکستان حق پر ہے اس لئے بات اسی کی صحیح مانی جائے گی اور فیصلہ حق اور انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہوگا چنانچہ جب بھارت نے اعلان کیا کہ وہ کشمیر میں بین الاقوامی استصواب کے لئے تیار ہے اور بعد میں اسی اعلان کا اعادہ اس نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے روبرو کیا تو پاکستان نے یہ یقین کر لیا کہ بس مسئلہ حل ہوگیا ۔ اس کے بعد جب بھارت آہستہ آہستہ کشمیر میں استصواب کو بہ لطائف الحیل ٹالنے لگا تو پاکستان نے سارا زور یہ جتانے پر صرف کیا کہ اس کے قول و فعل میں تضاد ہے ۔ بھارت کے قول و فعل میں تضاد تھا اور ہے لیکن بین الاقوامی محفل میں تو چھلنی اور چھاج جمع ہوتے ہیں ۔ وہاں اس تضاد کو کوئی نہیں دیکھتا ۔ ہر کوئی اپنے اپنے مصالح کو دیکھتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرتا ہے ۔ پاکستان یہی سمجھتا رہا کہ دنیا بھارت کے قول و فعل کے تضاد کو پوری طرح سمجھ نہیں پائی ۔ اس نے اپنی صداقت کو منوانے کے لئے دوسرے ممالک کے مقتدر اخبارات کے حوالے پیش کرنا شروع کئے جن میں پاکستان کے مقدمے کی حمایت کی گئی تھی، بھارت کی مذمت کی گئی تھی اور استصواب کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا ۔ بظاہر یہ بڑا کارگر حربہ ہونا چاہئے تھا لیکن اس کے باوجود بھارت بڑی طاقتوں اور متحدد افریقی ایشیائی اقوام کی توجہ اور عزت کا محور بنا رہا ۔ اور کشمیر کا مسئلہ معلق ہوتا گیا ۔

دنیا نے پاکستان کو تو غلط سمجھا ہی تھا خود پاکستان نے بھی دنیا کو غلط ہی

سمجھا۔ یہ غلط فہمی اب تک برقرار ہے اور نہ کشمیر کی قیامت اسے دُور کر سکی نہ فلسطین کا محشر اسے دگرگوں کر سکا۔ عام ذہن قوموں کے مابین دوستی اور دشمنی کے معیار کو افراد کی دوستی اور دشمنی کے معیار سے ہٹ کے نہیں دیکھ سکا۔ یہی ہماری گوناگوں پریشانیوں اور ناکامیوں کا اصل سبب ہے۔ قوموں کے درمیان دوستی اور دشمنی کا معیار بھی مختلف ہے اور اس کے اظہار کے طریقے بھی مختلف ہیں۔ یہ معیار اور اظہار کی صورتیں ضرورت کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں امریکہ، روس اور برطانیہ ایک دشمن جرمنی کے خلاف اتحادی تھے لیکن جنگ کے بعد وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ اسی طرح روس کبھی امریکہ کا حریف اور چین کا حلیف تھا اور اب وہ امریکہ کا دوست بن گیا ہو یا نہیں چین کا دوست یا کم از کم پہلے جیسا دوست نہیں رہا۔ دراصل کئی صدیوں سے دُنیا ایسے مقام پر پہنچی ہوئی ہے جہاں عالمی سطح پر تعلقات کی اساس قومی مملکتوں کے اپنے اپنے مفادات ہیں۔ اس اصول کی کارفرمائی عالمگیر ہے کہ ہر ملک خودمختار ہے اور اپنے ملکی مصالح کا وہی بہتر فیصلہ کر سکتا ہے اور کوئی ایسا قانون یا ادارہ نہیں جو اس خودمختاری کی تحدید کر سکے۔ دو عالمگیر جنگیں اس تصوّر کو اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکیں۔ اس صدی میں پہلے جمعیت اقوام تشکیل ہوئی اور اب اقوامِ متحدہ برسرِ کار ہے۔ یہ دونوں ادارے نہ بالائے قومی ادارے بنائے گئے نہ بن سکے۔ ان کا استعمال بھی ان کے کاغذی عزائم اور مقاصد کے علی الرغم دولِ عظمیٰ کے مصالح کے مطابق رہا اور ہے۔

چونکہ ہر قوم اپنے قومی مفاد اور مصالح کے مطابق اپنی حکمت عملی مرتب کرتی ہے اور اس پر کوئی بالائی ادارہ قدغن نہیں لگا سکتا، اس لئے دیگر اقوام کے قومی

طور پر نہیں تو اخلاقی طور پر ہی ساتھ دیں۔ چنانچہ اس نے روسی نمائندے کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے یہ قرارداد منظور کرالی کہ کوریا کی جنگ اقوام متحدہ کی جنگ ہے۔ گویا ہر چند امریکہ کوریا میں کم و بیش تنہا لڑا تاہم وہ دوست تلاش کرنے اور بنانے پر مجبور تھا اور یہ مجبوری اسے اقوام متحدہ کی کاغذی حمایت حاصل کرکے دُور کرنا پڑی۔

ویت نام میں امریکہ کو یہ تائید حاصل نہیں ہو سکی تو وہ پاگلوں کی طرح ٹکریں مار رہا ہے کہ دوسری قومیں اس کی سرسری اخلاقی امداد ہی کا اعلان کردیں۔ پاکستان جیسے ملک کو لالچ دے دے کر اس نے یہاں تک آمادہ کرنا چاہا کہ وہ اپنے دو ڈاکٹر ہی ویت نام میں بھیج دے۔ بڑی طاقتیں چھوٹی طاقتوں کے مقابلے میں ایک حد تک ہی خودسر ہو سکتی ہیں۔ اس کا مزید ثبوت ۱۹۶۵ میں ملا، گو اس کی اہمیت کا بالعموم اندازہ نہیں لگایا گیا۔ پاکستان نے کشمیر کے تصفیے کے لئے یہ شرط لگائی تھی کہ اقوام متحدہ تین مہینے کے اندر اندر حتمی فیصلہ نہ کرے تو پاکستان اس سے علیحدہ ہو جائے گا۔ یہ بہت بڑی دھمکی تھی اور اس سے اقوام متحدہ کی زندگی معرضِ خطر میں پڑ سکتی تھی کیونکہ چین اقوام متحدہ میں نہیں تھا۔ انڈونیشیا بھی نکل چکا تھا۔ اگر پاکستان بھی اسے خیرباد کہہ دیتا تو عالمی ادارے کی عالمی نمائندے کا رہا سہا بھرم بھی ختم ہو جاتا۔ اور پھر کون کہہ سکتا تھا کہ پاکستان کے بعد اقوام متحدہ سے باہر نکلنے کا راستہ چوپٹ نہیں کھل جائے گا۔ مزید براں بھارت کی جارحیت کا ناقابلِ یقین جرأت سے مقابلہ کرکے پاکستان جنگ کو اس کی حدود میں لے گیا اور بھارت کی شکست کے ساتھ تیسری عالمگیر جنگ یقینی نظر آنے لگی۔ گویا امنِ عالم کی کلید

پاکستان کے ہاتھ میں آگئی۔ چنانچہ بڑی قومیں لرزہ براندام دکھائی دینے لگیں اور سب کی نظریں پاکستان پر جم گئیں۔ جب پاکستانی وزیر خارجہ سلامتی کونسل میں جنگ بندی سے متعلق تقریر کر رہے تھے تو بڑی بڑی طاقتوں کے نمائندے کبھی گھڑی کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی پاکستانی نمائندے کی طرف۔

اس نفسیاتی کیفیت کا کس حد تک فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا، اس کا اندازہ چند دن بعد سلامتی کونسل میں ہو گیا۔ جنگ بندی کے بعد کی بات ہے کہ تصفیہ کشمیر کے سلسلے میں سلامتی کونسل میں تقریریں ہو رہی تھیں۔ پاکستانی وزیر خارجہ نے بجا طور پر ان مظالم کا ذکر شروع کر دیا جو باشندگانِ ریاست پر ڈھائے جا رہے ہیں۔ بھارت کی خاطر امریکہ اور روس نے پاکستانی نمائندے کو ٹوکا کہ وہ ریاست کے اندرونی حالات پر لب کشائی نہ کریں۔ پاکستانی وزیر خارجہ نے اس کے جواب میں یہ نہیں کہا کہ وہ بطورِ احتجاج تقریر ختم کر دیں گے یا اجلاس سے روٹھ کر چلے جائیں گے۔ انہوں نے ترکی بہ ترکی کہا کہ اگر انہیں بات کرنے کی اجازت نہ دی گئی تو پاکستان اسی وقت اقوامِ متحدہ کو خیر باد کہہ دے گا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ امریکی اور رُوسی نمائندے خاموش ہو گئے اور وزیر خارجہ نے تقریر جاری رکھی۔ گویا پاکستان نے اپنے سے کئی گنا بڑی طاقت بھارت کو محاذِ جنگ پر شکست دی اور امریکہ اور روس کو اقوامِ متحدہ میں شاہ مات دی۔

ستمبر ۱۹۶۵ میں امریکہ اور روس کیوں بھاگے بھاگے پھر رہے تھے کہ جنگ بند ہو جائے، اور سلامتی کونسل میں دونوں، وزیر خارجہ پاکستان کی دھمکی سے کیوں فوراً اپنا رویّہ بدلنے پر مجبور ہو گئے؟ پاکستان پہلے بھی چھوٹا ملک تھا اور جنگ کے

دوران بھی چھوٹا ہی ملک تھا۔ اگر حرفِ آخر قوت کا اور دولِ عظمیٰ ہی کا ہوتا تو پاکستان کیا دھمکی دے سکتا تھا! تنہا امریکہ طاقت کے زور پر پاکستان کو خاموش کر سکتا تھا۔ لیکن صورتِ حال ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ امریکہ دیکھ رہا تھا کہ طاقت کے استعمال کا نتیجہ متیسری جنگِ عظیم کی صورت میں نکلے گا اور معاملہ وہاں تک پہنچا تو وہ خود اس ہمہ گیر تباہی سے نہیں بچ سکے گا جو اس قیامت کے جلو میں آئے گی۔ اس سے بڑی قوموں کی بے چارگی اور چھوٹی قوموں کی قوت کے راز کی نشان دہی ہوتی ہے۔ بڑی قوموں کی ایک اور مجبوری یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی حریف ہیں۔ پہلے مقابلہ امریکہ اور روس میں تھا۔ اب صورت بدل کر پیچیدہ ہو گئی ہے۔ امریکہ صفِ اول کا دشمن چین کو سمجھتا ہے اور اس دشمنی میں اندھا ہو کر روس کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے کوشاں ہے۔ کبھی روس اور چین یک جان و دو قالب تھے۔ اب دونو حریف ہیں۔ روس چین کی مخالفت میں امریکہ سے ملنا تو چاہتا ہے لیکن روس امریکہ کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ چین پر غالب آ جائے۔ گویا دشمنی کے باوجود وہ امریکہ کے مقابلے میں چین کی حمایت پر مجبور ہے۔ اس پُر پیچ مقابلے کا یہ نتیجہ ہے کہ بڑی قومیں پہلے سے کہیں زیادہ چھوٹی قوموں کی دوستی کی محتاج ہو گئی ہیں۔ یہ راز پا لیا جائے تو بڑی قوموں کو ان کی بے پناہ اور روز افزوں جہاں سوز اور عالم تباہ قوت کے علی الرغم لگام دی جا سکتی ہے۔ گویا چھوٹی قوموں کے سامنے سوچنے اور کرنے کی بات یہ ہے کہ وہ بڑی قوموں کی اس مجبوری کو مفید مطلب بنائیں کہ انہیں چھوٹی قوموں کی خوشنودی اور حمایت حاصل کرنے کی ناگزیر ضرورت ہے۔ دوستی کی یہ باہمی احتیاج توازنِ تعلقات کا یقینی باعث ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں مسئلہ فلسطین سے متعلق روسی کردار کا جائزہ لیجئے۔ فرض یہ کر لیا گیا تھا کہ امریکہ اور برطانیہ اسرائیل کے دوست ہیں اور روس عربوں کا، اور نتیجہ یہ نکالا گیا تھا کہ دوستی کے مظاہرے میں روس عربوں کے دوش بدوش لڑائی تک میں شامل ہو جائے گا چنانچہ جب روس نے یہ توقع پوری نہ کی تو اس پر طرح طرح کے اعتراضات کئے گئے۔ مثلاً یہ کہ روس دراصل اسرائیل کا حامی ہے۔ آخر اس نے بھی تو ۱۹۴۸ میں اسرائیل کو تسلیم کر لیا تھا۔ وہ عربوں کا مخلص دل سے حامی ہوتا تو اسرائیل کو کبھی تسلیم نہ کرتا۔ اس طرح یہ ثابت کیا گیا کہ روس عربوں کا دوست نہ تھا نہ ہے۔ لہٰذا اس سے بھی ایک طرح کا قطع تعلق کر لینا چاہئے۔ یہ مشورہ دیتے ہوئے یہ نہ سوچا گیا کہ اس کا مطلب کیا نکل سکتا ہے۔ ذرا سوچئے امریکہ اور برطانیہ کی ہمدردی پہلے ہی اسرائیل کے ساتھ تھی، یعنی وہ عربوں کے ساتھ نہیں تھے۔ ایک روس عربوں کی حمایت کا دم بھرتا تھا لیکن مشورہ یہ دیا جا رہا تھا کہ اس سے بھی کنارا کر لیا جائے۔ اس مشورے پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ تو از خود عربوں کی امداد نہ کریں اور روس کو عرب اپنے طور پر ناخواندہ سمجھ کر اس سے کسی قسم کا سروکار نہ رکھیں۔ یہ مشورہ جتنا معقول نظر آتا ہے اتنا ہی خطرناک ہے کیونکہ عربوں کو جنگ سے جو نقصانات اٹھانا پڑے ان کی تلافی تو زیادہ تر امریکہ، برطانیہ اور روس کی طرف سے ہو سکتی تھی اور ان سے ہی دور رہنے کی تلقین کی جا رہی تھی۔ یہ درست ہے کہ عربوں کو روس سے جو شکایات پیدا ہوئیں ان شکایات کا اظہار بھی ہونا چاہئے تھا اور ان کے ازالے کی بھی صورت تلاش کرنی چاہئے تھی۔ ایسا ضرور ہونا چاہئے تھا اور روس کو جتایا جانا چاہئے تھا کہ اس نے عربوں کو مایوس

کیا۔ لیکن اصل سوال یہی ہے کہ جتایا کیسے جانا چاہئے تھا۔ اس کے طریق کار میں تو اختلافِ رائے ہوسکتا ہے لیکن اس میں کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے کہ ضرورت یہ سمجھنے کی ہے کہ روس نے وعدہ خلافی کی تو کیوں کی اور اسے کیسے ایفائے عہد پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ ایسی کوئی صورت عربوں کے لئے قابلِ غور نہیں ہوسکتی جو انہیں بین الاقوامی میدان میں بے یار و مددگار اور یکہ و تنہا بنا دینے کا موجب بنے۔ لیکن اس مشورے کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ عرب اکیلے رہ جائیں اور نہ ان کے نقصان کی تلافی کا امکان باقی رہے نہ تائید و حمایت کا۔

اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے روسی کردار کے پس منظر کو جاننا ضروری ہے۔ روس صدیوں سے اس کوشش میں رہا کہ وہ بحیرۂ روم اور بحیرۂ عرب تک پہنچے اور یورپ کے استعماری حریفوں کو ان پانیوں میں للکارے جن پر ان کی بالادستی ہے۔ یہی روسی ہوّا تھا جو برطانیہ کو خصوصیت سے ترکی، ایران اور افغانستان کی سرحدوں پر منڈلاتا دکھائی دیتا رہا اور جسے وہ ٹالنے کی دیوانہ وار کوشش کرتا رہا۔ روس اس میں برابر ناکام ہوتا رہا۔ ۱۹۳۶ء میں مانٹریو کنونشن کی بدولت اسے بحیرۂ اسود سے گذر کر بحیرۂ روم تک آنے کی مشروط اجازت ملی۔ اس اجازت کا عملی فائدہ وہ ۱۹۶۷ء میں اسرائیلی جارحیت ہی کے سلسلے میں اٹھا سکا۔ ۱۹۴۸ء میں فلسطین کی سرزمین میں اسرائیل کا تخم خبیث بویا گیا تو روس بھانپ گیا تھا کہ اس کے حریف برطانیہ اور امریکہ عالم عرب پر قدم جمائے رکھنے کے لئے اپنی فوجی چوکی اسرائیل کے نام پر بنا رہے ہیں۔ اس نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ یہ نہ اسرائیل

کی حمایت تھی نہ عربوں کی مخالفت بلکہ بحیرۂ روم تک پہنچنے کا ایک یقینی ذریعہ تھا۔ روس کی طرف سے اسرائیل کو تسلیم نہ کرنا اپنے قومی مفادات کو فراموش کر دینے کے مترادف ہوتا۔ اس طرح وہ برطانیہ اور امریکہ کا حریف بن کر اسرائیل میں آموجود ہوا۔ اس نے بتدریج عربوں کی حمایت شروع کر دی۔ اس سے ایک طرف برطانیہ اور امریکہ کی مخالفت مقصود تھی اور دوسری طرف یہ غرض پیش نظر تھی کہ عربوں کی حمایت کا دم بھرنے سے بحیرۂ روم تک آنے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ روس نے بعض عرب ممالک کی عسکری اور معاشی امداد بھی کی بلکہ ان عرب ممالک کی امداد کا واحد سرچشمہ روس ہی بن گیا۔ ان عرب ممالک کو روس کی امداد اور حمایت کی ضرورت اس لئے زیادہ ہوگئی کہ برطانیہ اور امریکہ نے ان سے منہ موڑ لیا تھا۔

ان حالات میں عرب ملکوں کی ضرورت یہ تھی کہ وہ روس سے عسکری اور معاشی مدد لیتے۔ اس کے برعکس روس کی ضرورت یہ تھی کہ وہ عالم عرب میں اپنا اثر و رسوخ بڑھاتا اور برطانیہ اور امریکہ کو بے دخل نہ کر سکتا تو ان کے مقابل ضرور کھڑا ہو جاتا۔ اس دو طرفہ ضرورت سے باہمی تعلقات کی قدر مشترک نکل سکتی تھی۔ اس سے عربوں کو یہ فائدہ پہنچتا کہ اپنی جو ضروریات وہ از خود یا مغربی ممالک کی وساطت سے پوری نہیں کر سکتے وہ روس کے ذریعے پوری کر لیں اور روس کو یہ فائدہ پہنچتا کہ وہ عالم عرب میں برطانیہ اور امریکہ کا مدِ مقابل ہو جاتا۔ ایک حد تک عربوں اور روس نے مطلوبہ فوائد حاصل کر بھی لئے۔ عربوں کو روس نے قبل از وقت متنبہ کیا کہ اسرائیل بھرپور حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس نے دوست عرب ممالک کو عسکری امداد بھی دی۔ جنگ کے بعد روس نے ان کے نقصان کی بھی تلافی کی اور

اقوام متحدہ میں بھی عربوں کے حق میں ایک حد تک جنگ لڑی۔ یہ کہنے کی گنجائش یقیناً ہے کہ روس عربوں کے لئے جنگ کے دوران اور اس کے بعد اور بہت کچھ کر سکتا تھا جو اس نے نہیں کیا۔ لیکن یہ کہنا درست ہو یا نہ ہو بے سود ضرور ہے کہ وہ دل سے عربوں کا دوست نہیں۔ دلوں کو کون دیکھتا ہے۔ دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ روس اپنی دوستی کس قیمت پر عربوں کے ہاتھ بیچنے پر تیار ہے اور عرب اپنی دوستی روس کو کس بھاؤ دیں گے۔ بین الاقوامی سیاست کا کمال ان دو قیمتوں میں ایسا توازن پیدا کرنا ہے جو دوسرے کے مفاد کو نقصان پہنچائے بغیر اپنے مفاد کا تحفظ کرے۔

عرب روس سے جو قیمت وصول کر سکتے تھے وہ نہ کر سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ بین الاقوامی دوستی کے پیمانوں کا تعین نہ کر سکے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان میں باہمی تشتت و افتراق تھا اور جنگ کے انتہائی تلخ تجربے کے باوجود بدستور موجود ہے۔ آپس میں لڑنے والے غیروں سے سودا کر کے خسارے میں ہی رہیں گے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ عربوں کو اپنی دوستی کی قدر و قیمت بڑھانے کے لئے جو کچھ قدرتی طور پر کرنا چاہئے تھا وہ انہوں نے نہیں کیا۔ دنیا کے نقشے پر سرسری نظر ڈالتے ہی یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ مسلمان ممالک باہمی طور پر متصل بھی ہیں اور تاریخ و ثقافت کے ایسے ناقابلِ شکست رشتے میں بھی منسلک جو غیر مسلم ہمسایہ اقوام کو بالکل میسر نہیں۔ پھر مسلمان علاقے ایسی اہمیت کے مالک ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ دینے پر آجائیں تو بڑی طاقتیں ان کی دست نگر ہو جائیں۔ عربوں نے اس مضبوط رشتے سے بالعموم بے اعتنائی برتی

اور ان میں سے بعض نے تو اس بھارت پر تکیہ کیا جو عالمی بساط پر امریکی استعمار کا مہرہ بن کر ایشیا اور افریقہ کی غلامی اور ذلت کا سامان پیدا کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اس جسمانی طور پر عظیم اور کردار کے لحاظ سے آبرو باختہ ملک پر بھروسہ کر کے عرب خسارے ہی کا سودا کر سکتے تھے۔ یہ امر موجب اطمینان ہے کہ جون ۱۹۶۷ کی رستاخیز سے دوست اور دشمن کی تمیز آسان ہو گئی ہے۔ نیز عالمی سطح پر دوستی اور دشمنی کے تقاضے واضح تر ہو گئے ہیں۔ خود پاکستان کے لئے اس میں موعظت اور عبرت ہے۔ پاکستان اور اعراب کے تنازعات کا حل ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اقبالؒ نے سنا تھا کہ غلامی سے اُمتوں کی نجات —— خودی کی پرورش و لذّتِ نمود میں ہے —— اور پاکستان نے ستمبر کے تاریخی معرکے میں برای العین دیکھ لیا کہ اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے سامنے اپنی جبین اور تاریخ کے وہ اوراق ہیں جنہیں خامۂ حق نے اس لئے خالی چھوڑ دیا تھا کہ ہم اپنے قلم سے اپنی سرگزشت لکھیں اور دنیا پر ایک بار پھر ثابت کر دیں کہ

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز

یہ سرگذشت لکھی جانے لگی ہے۔ اب نہ ہاتھ رُک سکتا ہے، نہ قلم تھم سکتا ہے!

جنرل محمد اکبر خان کی تصانیف

کے لیے

مندرجہ ذیل پتے پر خط و کتابت کیجئے

اسلامک ملٹری سائنس ایسوسی ایشن

"قدسی" پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس

کراچی-۲۹

سیّارہ ڈائجسٹ

لاکھوں پاکستانی گھرانوں اور پاک افواج میں کیوں مقبول ہے؟
اس سوال کا جواب، ہر مہینے، سیّارہ ڈائجسٹ خود ہی پیش کیا کرتا ہے۔

قوم کی حوصلے اور شجاعت کی داستانیں

تاریخِ اسلام کے گم گشتہ واقعات، برِّصغیر میں مسلمانوں کی جنگِ آزادی کی بھولی بسری کہانیاں، معلوماتی، نفسیاتی، علمی اور ادبی مضامین، حوصلے بلند کرنے والی سچی آپ بیتیاں اور جگ بیتیاں، آپ کی اُلجھنوں اور مسائل کے حل اور ایسی کہانیاں جو تفریحی بھی ہوتی ہیں اور اصلاحی بھی، صرف "سیّارہ ڈائجسٹ" میں شائع ہوتی ہیں۔

ہر اپریل میں سالنامہ (ضخامت دُگنی) اور ستمبر میں جہاد نمبر (ضخامت ڈیڑھ گنا) دو خاص شمارے نہیں

بلکہ

دو مستقل اہمیت کی کتابیں ہوتی ہیں

محشرِ فلسطین

فلسطین کی سرزمین صدیوں سے حق و باطل کے معرکوں کا میدانِ جنگ بنی ہوئی ہے۔ رسولِ اکرم صلعم نے اسی میدان میں روما کے حملے کو روکا تھا۔ زید بن حارثؓ اور خالد بن ولید نے اسی میدان میں روما کے لشکر کو شکستِ فاش دی تھی۔ صلاح الدین ایوبی نے انہی ریگزاروں میں قلیل نفری سے صلیبیوں کو ناک چنے چبوائے تھے۔ فلسطین کی ریت کے ذرّے ابھی تک اسلام کے اوّلین غازیوں اور شہیدوں کے نعروں سے گونج رہے تھے مگر جون ۱۹۶۷ کی

عرب اسرائیل جنگ

میں اسرائیلیوں کی فاتحانہ للکار گونجی ——— "ہم دو ہزار برس بعد اپنی سرزمین پر واپس آگئے ہیں"

یہ حادثہ کیونکر ہوا؟ ——— ایک تجربہ کار جرنیل اور ایک منجھا ہوا ایڈیٹر اس سوال کا تفصیلی جواب پیش کر رہے ہیں۔ فلسطین کو خون میں ڈوبا ہوا بھی دیکھیے اور عالمی سیاست بازی کی بھول بھلیوں میں بھٹکا ہوا بھی۔